اماموں اور علما پر ظلم کی خاموش داستان

اور اُس کے خفیہ گوشوں کو اُجاگر کرتی ایک چشم کشا تحریر

امام کو کس نے مارا؟

حملہ امام پہ تھا یا دین پر

- امام مقتدیوں کی عدالت میں
- ایک جان ہزار ذمے داریاں
- مفتیان کرام مزدوروں کی صف میں
- کون ہے چھ ہزار کے پیچھے؟

مفتی جمال احمد برکاتی مصباحی

صراط پبلیکیشنز
siraatpublications@gmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم
اماموں اور علما پر ظلم کی خاموش داستان
اور اُس کے خفیہ گوشوں کو اُجاگر کرتی ایک چشم کُشا تحریر
بنام
امام کو کس نے مارا؟
حملہ امام پہ تھا یا دین پر؟
مصنف
مفتی جمال احمد برکاتی مصباحی
SIRAAT PUBLICATIONS
+919760347534
+919760347534
Siraatpublications
Siraat Studio
siraatpublications@gmail.com
اس کتاب کو آن لائن خریدنے کے لیے www.amazon.in پر کتاب
کا نام لکھ کر سرچ کریں یا 9760347534 پر رابطہ کریں۔

امام کو کس نے مارا؟

نام مصنف	مفتی جمال احمد برکاتی مصباحی
تقدیم و تقریظ	علامہ مولانا سید فیضان احمد چشتی مصباحی
پروف ریڈنگ	مولانا افضال مدنی، عائشہ رضا
سیٹنگ و ڈیزائننگ	کمال احمد عطاری مصباحی
باہتمام	مفتی سرفراز احمد عطاری مصباحی، مولانا قاری اسلم رضا
صفحات	۱۵۲
سن اشاعت	۱۴۴۲ھ مطابق ۲۰۲۱ء (پہلا ایڈیشن)
ناشر	صراط پبلیکیشنز، بھوج پور، مراد آباد (یوپی)

SIRAAT PUBLICATIONS

siraatpublications@gmail.com

تقدیم و تقریظ

علامہ مولانا سید فیضان احمد چشتی مصباحی
ولی عہد خانقاہ چشتیہ برخوردار یہ، کالون گنج، باندہ، یوپی

محترم مولانا جمال احمد مصباحی جو میرے خاص دوستوں میں بھی شامل ہیں، دینی و دنیوی اعتبار سے بہت اعلیٰ صلاحیتوں اور قابلیتوں کے مالک ہیں۔ جامعہ اشرفیہ مبارک پور جیسے نہایت معتبر و مستند دینی ادارے سے فضیلت و مصباحیت کی سند لی اور اب ماشاء اللہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں علومِ سیاسیات سے ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں۔

میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب چند ایام قبل میرے پاس رام پور آئے اور کہنے لگے کہ سید صاحب میں نے ایک حقیر سی قلمی کاوش کی ہے، آپ اسے ملاحظہ کر لیجیے اور کچھ تاثرات رقم کر دیں۔ مولانا کی یہ تازہ کاوش "امام کو کس نے مارا" نام سے ہے۔ بظاہر نام بڑا عجیب ہے لیکن آج سماج نے مساجد کے ائمۂ کرام کی جو درگت بنا رکھی ہے کتاب میں اُس کو اُجاگر کیا گیا ہے اور اس حوالے سے بہت سی اصلاحات رکھی گئی ہیں۔

حالاں کہ آج بہت سے ایسے ٹاپکس ہیں جن پر لکھنے والے عموماً روایتی اور گھسے پٹے انداز میں لکھتے نظر آتے ہیں۔ ائمۂ مساجد کی تنخواہوں کا ٹاپک بھی انہیں میں سے ایک ہے۔ لیکن مجھے خوشی کے ساتھ حیرت ہے کہ مولانا نے ٹاپک کو بہت اچھا نبھایا ہے، فکر و خیال واضح ہے، کوئی بات چبا کے یا دبا کے نہیں کہی ہے، اندازِ بیاں ایسا کہ بس پڑھتے جائیے۔ پوری کتاب دین و اصلاح کے جذبے سے لکھی گئی ہے۔ ملت و قوم کے تئیں خیر

خواہانہ فکر سطر سطر سے عیاں ہے۔کتاب کے موضوعات وبیانِ موضوعات سے صاف ظاہر ہے کہ لکھنے والا مخلص عالمِ دین بھی ہے اور دنیوی علوم سے بہرہ مند بھی ہے۔

آخر میں میری دعا ہے کہ پروردگار عالم جل وعلا اپنے حبیب پاک صاحب لولاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ وطفیل مولانا جمال مصباحی کے علم وفکر وعمل واقبال میں خوب خوب برکات فرمائے اور ان کی اس اصلاحی کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور سماج کے درمیان مقبول ومفید بنائے۔آمین

احقر العباد: سید فیضان احمد چشتی مصباحی
ولی عہد خانقاہ چشتیہ برخوردار یہ، کالون گنج، ضلع باندہ، یوپی

فہرست

مجبوروں کی تلاش

ہماری دنیا کچھ اس طریقے سے چلتی ہے کہ جب ہم کسی دوسرے فرد سے اپنی زندگی کی ضرورت کا کوئی سامان خریدتے ہیں یا اسے اپنے گھر یا دفتر میں یا کسی اور جگہ کسی قسم کا کام کروانے کے لیے اپنے گھر لاتے ہیں یا کسی کو اپنے گھر، دوکان یا کمپنی کے لیے ملازم رکھتے ہیں تو اس کے سامان کی قیمت یا اس کے کام کی اجرت ہم اس کی محتاجی کو دیکھتے ہوئے طے کرتے ہیں۔ ہم اس بات کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس فرد کو اپنا سامان بیچنے کی کتنی سخت ضرورت ہے؟ یا اسے ہمارے یہاں کام یا ملازمت مل جانے کی کس قدر ضرورت ہے؟ یعنی اپنے سامان کو بیچنے کے لیے یا کام مل جانے کے لیے وہ کتنا پریشان ہے؟

نہ تو ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ جس سامان کو وہ بیچنا چاہتا ہے اس کی مناسب قیمت کیا ہوگی؟ اور نہ ہی ہم اس طرف توجہ دینا چاہتے ہیں کہ جس کام یا ملازمت کے لیے ہم اس کو اپنے یہاں رکھنا چاہتے ہیں اس کام یا ملازمت کی مناسب اجرت کیا ہوگی؟ اور ساتھ ہی ہم یہ بھی جاننا اور سمجھنا نہیں چاہتے کہ اس شخص کی زندگی کے اصل حالات کیا ہیں؟ وہ اپنی زندگی میں کس قدر پریشان ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں وہ اپنے گھر میں انتہائی تنگدستی اور غربت کا شکار ہے؟

کسی دوسرے فرد سے کسی سامان کو خریدتے ہوئے ہم جس بات کو سننا اور سمجھنا چاہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ وہ اس سامان کو بیچنے کے لیے کتنا مجبور ہے؟ ایک سامان اپنی مناسب قیمت کے لحاظ سے دس ہزار روپے کا ہو سکتا ہے۔ اور ہو سکتا ہے جو فرد اس سامان

کو بیچنا چاہتا ہے اسے دس ہزار روپے کی ہی ضرورت ہو۔ اور اسی لیے وہ اس سامان کو بیچنا چاہتا ہے۔ اور اس کے پاس اس کے علاوہ بیچنے کے لیے کوئی دوسرا سامان بھی نہیں ہے۔ اس لیے اس کے من میں یہ بات بھی ہے کہ اگر دس ہزار مل جائیں تو اچھا ہے جو اس کی مناسب اور واجبی قیمت ہے۔ لیکن اگر دس ہزار نہ بھی ملیں تو یہ سامان کسی نہ کسی طرح نکل جائے۔ اگرچہ کتنا ہی سستا کیوں نہ نکل جائے۔ تین ہزار ہی مل جائیں۔ کچھ نہ کچھ پیسے تو ہاتھ آہی جائیں گے۔

غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس معاملے میں تین اہم چیزیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس سامان کی واجبی اور مناسب قیمت دس ہزار روپے ہے۔ دوسری یہ کہ اس شخص کو دس ہزار روپے کی اشد ضرورت ہے۔ تیسری یہ کہ وہ شخص اپنی مجبوری کی وجہ سے اس سامان کو تین ہزار روپے میں بیچنے کے لیے بھی تیار ہو جائے گا، اگرچہ اس کو دس ہزار کی ضرورت ہے۔

ہماری دلچسپی نہ یہ جاننے میں ہوتی ہے کہ اس سامان کی واجبی قیمت کیا ہے؟ نہ یہ جاننے میں ہوتی ہے کہ اس شخص کو دس ہزار روپے کی سخت ضرورت ہے۔ ہمیں صرف یہ جاننے میں دلچسپی ہے کہ وہ مجبور کتنا ہے؟ اور ہم اسے ٹٹول ٹٹول کر کسی نہ کسی طرح یہ معلوم کر ہی لیں گے کہ وہ اتنا مجبور ہے کہ وہ اپنے دس ہزار روپے کے سامان کو تین ہزار روپے میں بیچنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ اس لیے ہم اس سے کہتے ہیں کہ آپ کا یہ سامان ہم دو ہزار روپے میں خرید سکتے ہیں۔ اب آپ کا سودا بنتا ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ آپ آگے دیکھیے۔ ہم نے اس کی مجبوری کو سمجھ کر فوراً اس کے ساتھ سودے بازی شروع کر دی۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ دو ہزار میں دینے کے لیے تیار نہ ہوگا تو ہم ایک ہزار روپے اور بڑھا دیتے ہیں اور ہم اس سے کہتے ہیں کہ ہم تین ہزار روپے دے سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ نہیں۔ اب آپ کو اوسط آتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ ہم آپ کو مجبور تو کر نہیں رہے ہیں۔ آپ کی مرضی ہو تو دیجیے،

ورنہ چلے جائیے۔ بے شک ہم نے اس کو مجبور نہیں کیا، لیکن اس کی زندگی کے حالات نے اس کو مجبور بنایا ہوا ہے۔ وہ اپنی مجبوری کی وجہ سے اپنے دس ہزار روپے کے سامان کو تین ہزار روپے میں بیچنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اور آخر بیچ کر چلا جاتا ہے۔

یہی سوچ ہماری اس وقت ہوتی ہے جب ہم کسی دوسرے انسان کو اپنے یہاں کام کے لیے لاتے ہیں یا اس کو اپنے یہاں ملازمت دیتے ہیں۔ ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ کم سے کم کتنے روپے میں ہمارے یہاں کام یا ملازمت کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ وہ چوں کہ مجبور اور بے بس ہوتا ہے۔ اس کو جتنا بھی دیا جائے اسی کو غنیمت سمجھتا ہے۔ اس لیے وہ معمولی سے معمولی اجرت یا تنخواہ میں راضی ہو جاتا ہے۔ اور ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اس کو مجبور تو نہیں کیا تھا نا۔ وہ خود راضی ہوا تھا۔ وہ کیوں راضی ہوا؟ کسی اور کو اپنا سامان بیچ دیتا۔ یا کسی اور کے یہاں کام یا ملازمت کر لیتا۔

لیکن یہ کہتے ہوئے ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر وہ کسی اور کو سامان بیچتا یا کسی اور کے یہاں کام یا ملازمت کرتا تو وہ بھی اس کے ساتھ اسی طرح پیش آتا۔ وہ بھی اس کو اس کے سامان، کام یا ملازمت کے اتنے ہی پیسے دیتا اور کہتا کہ اگر آپ اتنے روپے میں دے سکتے ہیں تو دیجیے یا اتنے روپے میں کام یا ملازمت کر سکتے ہیں تو کیجیے ورنہ آگے دیکھیے۔ ہم آپ کو مجبور تو کر نہیں رہے ہیں۔

اس طرح کا سماج جس میں لوگوں کی زندگی کی ضرورتوں کی بجائے ان کی مجبوریوں کو دیکھا جاتا ہو، ان کی پریشانیوں کو ٹٹولا جاتا ہو، چیزوں اور کاموں کی اصل اور مناسب قیمت اور اجرت دینے کے بجائے لوگوں کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھایا جاتا ہو، وہ سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن ایک اسلامی سماج نہیں ہو سکتا۔ اس طرح کے سماج میں رہنے اور جینے والے لوگ سب کچھ ہو سکتے ہیں لیکن وہ اللہ اور اس کے حبیب مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو کار اور

محبت کرنے والے نہیں کہلائے جاسکتے۔ اسلام چیزوں کی اصل اور واجبی قیمت کو دیکھتا ہے۔ اسلام لوگوں کی مجبوریوں کا فائدہ نہیں اٹھاتا۔ بلکہ وہ ایسے مشکل وقت میں ان کی مدد کرنے کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہے۔ وہ ان کی مجبوریوں کو نہیں ٹٹولتا۔

ایسا کئی بار ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کسی سے کوئی سامان خریدا تو آپ نے اسے اس کے سامان کی قیمت اس سے بھی زیادہ دی جتنی سامان بیچنے والے نے اپنے سامان کے لیے متعین کی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ اس سامان کا مالک اپنے سامان کو کم سے کم کتنے پیسوں میں بیچنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ آپ کی نظر کبھی اس سامان کی اصل اور واجبی قیمت پر ہوتی تھی اور کبھی سامان بیچنے والے کی اصل ضرورت پر۔

یتیموں کا مال مفت میں لینے سے انکار کر دیا

ہجرت کے بعد مدینے میں مسلمانوں کے باجماعت نماز ادا کرنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ بنو النجار کے باغ کی جگہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کی تعمیر کے لیے مناسب سمجھا اور اس کو خریدنا چاہا۔ ان لوگوں نے زمین کو مسجد کی تعمیر کے لیے مفت میں پیش کر دیا۔ یہ زمین دو یتیم بچوں کی تھی۔ آپ نے زمین کو مفت میں لینے سے انکار کر دیا اور ان دونوں یتیم بچوں کو بلوایا۔ بچوں نے بھی زمین کو مفت میں دینا چاہا۔ آپ نے اسے مفت میں لینے کو پسند نہیں فرمایا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مال سے اس کی قیمت ادا کر دی۔ (1)

جب لوگ اور وہ دونوں یتیم بچے اپنی زمین کو مسجد نبوی کی تعمیر کے لیے مفت میں ہی دینے کے لیے تیار تھے تو پھر پیسے خرچ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ویسے بھی اس جگہ کو

(1) شاہ عبدالحق محدث دہلوی، مدارج النبوۃ (مرکز اہل سنت برکات رضا) ج:۲، ص:۶۷-۶۸

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ذاتی استعمال کے لیے تولینا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ اللہ کے گھر کی تعمیر کے لیے لینا چاہتے تھے۔ اور اس جگہ کو مسجد کے لیے مفت میں دینا ان دونوں یتیم بچوں کے حق میں بھی بہتر تھا۔ یہ ان کے لیے صدقہ جاریہ ہوجاتا۔ اس مسجد کی وجہ سے قیامت تک کے لیے ان کے نامۂ اعمال میں ثواب لکھا جاتا رہتا۔ لیکن پھر بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مفت میں لینے سے انکار کردیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی نظر اس بات پر نہیں تھی کہ وہ زمین کم سے کم کتنی قیمت میں حاصل ہوجائے گی یا زمین والے لوگ اس زمین کو کم سے کم قیمت میں بیچنے کے لیے کس حد تک مجبور ہیں؟ آپ ان بچوں کی ضرورت اور ان کے حالات زندگی کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ آپ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی جگہ مفت میں مسجد کے لیے لے لی جائے اور ان کی زندگی کو مشکل میں ڈال دیا جائے۔ آپ نے سودے بازی نہیں کی بلکہ ان کی ضرورت کو سامنے رکھا۔ اور درست بات تو یہ ہے کہ یہاں سودے بازی کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ جگہ مفت میں پیش کی جارہی تھی۔

غلام کو آٹھ سو درہم میں خریدا

اب حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی مندرجہ ذیل حدیث دیکھیے:

بلغ رسول الله صلى الله عليه وسلم أن رجلا من أصحابه أعتق غلاما له عن دبر ولم يكن له مال غيره، فباعه بثمان مائة درهم ثم أرسل ثمنه إليه۔[۲]

ایک صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے غلام کو اپنی وفات کے بعد کے لیے

---

(۲) محمد بن إسماعيل البخاري، صحيح البخاري (دار طوق النجاة، بيروت: ۱۴۱۱ھ) رقم: ۶۷۱۶
مسلم بن الحجاج، صحيح مسلم (دار ابن حزم، بيروت: ۱۴۱۹ھ) رقم: ۱۲۸۹

آزاد کردیا۔ لیکن ان کے پاس اس غلام کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلام کو ان سے آٹھ سو درہم میں خرید لیا اور یہ درہم ان کو بھجوا دیے۔ (ت)(۳)

جن صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا غلام تھا انہوں نے اپنے غلام کو آزاد کردیا۔ ان کے پاس اس غلام کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا پھر بھی اس کو اپنی زندگی کے بعد کے لیے مفت میں آزاد کردیا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے غلام کو اچھی قیمت میں بیچتے اور اس کے عوض میں جو پیسہ ملتا اس کو اپنی زندگی کی ضروریات میں خرچ کرتے۔ اور پھر اگر انہوں نے ایسا کر ہی لیا اور اسے مفت میں آزاد کردیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے غلام کو کیوں خریدا؟ اور وہ بھی آٹھ سو درہم میں کیوں؟

دراصل آپ نے اس غلام کو اپنی ضرورت کے لیے نہیں خریدا۔ بلکہ آپ نے اپنے صحابی کے حالات زندگی اور ان کی ضرورت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ان کے غلام کو خریدنے کا فیصلہ کیا۔ آپ نے ان کے غلام کو آٹھ سو درہم میں خرید کر ان کو آٹھ سو درہم کا مالک بنایا اور دوسری طرف اس خریدے ہوئے غلام کو آزاد کر کے اپنے صحابی کی اس خواہش کو بھی پورا کردیا کہ ان کا غلام ان کے بعد آزادانہ زندگی گزارے۔ آپ نے ان کے غلام کو آزادانہ زندگی کا موقع دینے کے لیے اپنے صحابی کی وفات کے انتظار کو مناسب نہ سمجھا۔ آپ نے چاہا کہ غلام کو فوراً آزادی ملے اور دوسری طرف میرے صحابی کو سہارا بھی لگے۔

ایک غلام کو دو غلاموں کے بدلے میں خریدا

جاء عبد، فبايع النبي صلى الله عليه وسلم على الهجرة، ولا يشعر

---

(۳) "(ت)" سے مراد ترجمہ ہے۔ اس اشارے کو اس کتاب میں متعدد جگہ یہ بتانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے کہ یہاں ترجمے کا اختتام ہوتا ہے۔

النبي صلى الله عليه وسلم أنه عبد، فجاء سيده يريده، فقال النبي صلى الله عليه وسلم : "بعنيه". فاشتراه بعبدين أسودين، ثم لم يبايع أحدا بعد حتى يسأله: "أعبد هو ؟"[۴]

ایک غلام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آپ کے ہاتھ پر ہجرت کے لیے بیعت کی۔ ابھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے غلام ہونے کے بارے میں معلوم نہیں ہوا تھا۔ غلام کا مالک اسے لینے کے لیے آگیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مالک سے فرمایا: "اس غلام کو مجھے بیچ دو۔" آپ نے اسے دو سیاہ فام غلاموں کے عوض خرید لیا۔ پھر اس کے بعد آپ نے کسی کو یہ جانے بغیر بیعت نہیں کروائی کہ وہ غلام تو نہیں ہے۔[ت]

جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ وہ غلام ہے تو آپ اسے کہہ سکتے تھے کہ وہ اپنے مالک کے پاس جائے۔ یا آپ اس سے کہہ سکتے تھے کہ تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں تھا کہ تم کسی کے غلام ہو؟ اور مجھے اس بات کی خبر نہ دینا تمھاری غلطی ہے اس لیے تم اپنے مالک کے پاس واپس جاؤ۔ لیکن جب اس غلام کا مالک اس کو لینے کے لیے آیا تو آپ نے اس طرح کی کوئی بات نہ کی۔ بلکہ آپ نے اس غلام کو دو غلاموں کے بدلے میں خرید لیا۔ آپ نے ایسا اس وجہ سے کیا کہ اگر آپ اس غلام کو اس کے مالک کے پاس واپس جانے کو کہتے تو یہ بات اس کو بہت تکلیف دیتی۔ اس نے اپنے من ہی من میں ہجرت کے بارے میں کتنی بار سوچ لیا ہوگا۔ یہ بات اس کے ذہن میں پوری طرح بیٹھ گئی ہوگی کہ اس نے ہجرت کرنا ہے۔ ایسے میں اس کو ہجرت سے یکسر منع کر دینا اس کے لیے برداشت کرنا آسان نہ تھا۔ قابل غور بات ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلام کی اس جذباتی کیفیت اور

---

(۴) أبو عيسىٰ الترمذي، جامع الترمذي (دار الفكر، بيروت: ۱۴۱۴ھ) رقم: ۱۲۳۹

ضرورت تک کا لحاظ کیا اور اس کو نگاہ میں رکھا۔ اس کو واپس بھیجنے کے بجائے اسے دو غلاموں کے عوض میں خرید لیا۔ اور ادھر ہم اکیسویں صدی کے مسلمان لوگوں کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے ساتھ سودے بازیاں کرنے میں لگے ہیں۔

قرضہ زیادہ کر کے واپس کیا

عن جابر رضي الله تعالى عنه قال: كان لي على رسول الله صلى الله عليه وسلم دين فقضاني وزادني.[۵]

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر میرا کچھ قرضہ تھا۔ آپ نے جب میرا قرضہ ادا کیا تو جتنا تھا اس سے زیادہ دیا۔[ت]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اتنی ہی رقم واپس کیوں نہیں دی جتنی ان کی بنتی تھی؟ ان کو ان کے قرضے سے زیادہ کیوں دیا؟ نہ زیادہ کے لیے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا۔ نہ ایسا خدا کا حکم تھا۔ نہ آپ ﷺ کے اوپر کسی کا کوئی دباؤ تھا۔ اور بھلا آپ ﷺ کے اوپر کس کا دباؤ ہو سکتا ہے؟ اور کس کا دباؤ ﷺ کے اوپر چل سکتا ہے؟ وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ کی نگاہ میں یہ بات نہیں ہوتی تھی کہ کس کا کتنا بنتا ہے؟ اس کے بجائے آپ ﷺ کی نگاہ لوگوں کی زندگی، ان کی ضروریات اور ان کی خوشی پر ہوتی۔

مانگنے والے کو ادھار لے کر دیا

عن أبي هريرة، قال: أتى رجل رسول الله صلى الله عليه وسلم

(۵) محمد بن إسماعيل البخاري، صحيح البخاري (بيروت: دار طوق النجاة: ۱۴۱۱ھ) رقم: ۲۳۹۴
أبو داؤد السجستانی، سنن ابو داؤد (المكتبة العصرية، بيروت) رقم: ۳۳۴۷

يسأله. فاستسلف له رسول الله صلى الله عليه وسلم شطر وسق فأعطاه إياه. فجاء الرجل يتقاضاه فأعطاه وسقا. وقال: "نصف لك قضاء ونصف لك نائل من عندي."(٦)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت کیا کہ ایک شخص نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہو کر آپ سے کچھ مانگا۔ آپ نے کسی سے آدھا وسق (٧) ادھار لے کر اس کو دے دیا۔ پھر جس سے ادھار لیا تھا وہ اپنا قرض واپس لینے کے لیے آیا۔ آپ نے اسے ایک وسق دیا۔ آپ نے فرمایا: "آدھا وسق آپ کا ہے اور آدھا وسق آپ کے لیے ہماری طرف سے ہے۔"(ت)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کی ضرورت پوری کرنے کے لیے دوسرے شخص سے آدھا وسق قرض لیا۔ جس سے قرض لیا جب وہ اپنا قرض مانگنے کے لیے آیا تو آپ نے اسے پورا ایک وسق دیا۔ جب آپ کے ذمے اس کا آدھا ہی وسق بنتا تھا تو آپ آدھا ہی وسق دیتے۔ نہ زیادہ کسی نے مانگا تھا اور نہ آپ کے ذمہ بنتا تھا۔ پھر بھی آپ نے ایک وسق کیوں دیا؟ دراصل آپ نہ سوداگری کرتے نہ سودے بازی۔ آپ کی نظر اس بات پہ گئی کہ اس نے ایک شخص کی مدد کرنے میں میرا تعاون کیا۔ میں نے اس سے ایک شخص کی مدد کے لیے کچھ دینے کو کہا اس نے دے دیا۔ آپ نے یہ دیکھا کہ اس کے کام کی مناسب قیمت کیا بنتی ہے؟ اور وہ آپ کی نگاہ میں آدھے وسق سے تو ہر حال میں زیادہ بنتی تھی۔ اس لیے اس کو آدھے وسق سے زیادہ ہی دیا۔

---

(٦) أبو بكر البيهقي، السنن الكبرى (دار الكتب العلمية، بيروت: ٢٠٠٣ء) رقم: ١٠٩٣٠

(٧) ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے۔ اور ایک صاع کا وزن چار کلو اور تقریباً 94 گرام ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے آدھا وسق کا وزن تقریباً 122.82 کلو بنتا ہے۔

بہتر اونٹ واپس کیا

عن أبي رافع، قال: استسلف رسول الله صلى الله عليه وسلم بكرا، فجاءته إبل من الصدقة. فأمرني أن أقضي الرجل بكره. فقلت: لم أجدفي الإبل إلا جملا خيارا رباعيا. فقال النبي صلى الله عليه وسلم: "أعطه إياه، فإن خيار الناس أحسنهم قضاء."(۸)

حضرت ابورافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی سے ایک چھوٹا اونٹ بطور قرض لیا پھر آپ کے پاس صدقے کے کچھ اونٹ آئے تو آپ نے مجھے حکم دیا کہ میں قرض خواہ کو اس کا اونٹ لوٹادوں۔ میں نے عرض کیا: یہ سبھی اونٹ تو چھ سالہ اور اچھی قسم کے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "انہیں میں سے ایک اونٹ اسے دے دو۔ بہترین لوگ وہ ہیں جو قرض کی ادائیگی میں اچھے ہوں۔"(ت)

جو اونٹ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرضے میں لیا تھا وہ اتنا اچھا نہیں تھا جتنا اچھا اونٹ آپ نے قرض خواہ کو واپس دلوایا۔ اور نہ ہی اس کے اونٹ سے زیادہ اچھا اونٹ دینا آپ کے ذمے ضروری تھا۔ اور نہ ہی اونٹ والے نے اپنے سے اچھا اونٹ طلب کیا تھا۔ اور بغیر حق کے وہ طلب کر بھی کیوں سکتا تھا؟ آپ نے پھر بھی اسے بہترین قسم کا اونٹ دلوایا۔ وجہ وہی تھی کہ آپ سودے بازی اور سوداگری میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ اس نے آپ کو قرض دے کر آپ کی اس وقت مدد کی جب آپ کو ضرورت تھی۔ اس لیے آپ کے نزدیک اس کی مدد کی قیمت ویسا اونٹ نہیں جیسا اس نے دیا تھا بلکہ اس سے اچھا اونٹ بنتی تھی۔ اس لیے آپ نے اسے اس کے اونٹ سے اچھا اونٹ دلوایا۔

---

(۸) أبو داؤد السجستانی، سنن أبو داؤد (المكتبة العصرية، بيروت) رقم: ۳۳۴۶

اوپر ذکر کیے گئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے تمام واقعات ہمیں بتاتے ہیں کہ ایک اسلامی معاشرہ اور ایسا معاشرہ جس کا قیام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود چاہتے تھے اسی وقت وجود میں آسکتا ہے جب لوگ آپس میں ایک دوسرے سے سامان خریدتے اور بیچتے وقت، ایک دوسرے کے یہاں کام اور ملازمت کرتے یا ایک دوسرے کو اپنے یہاں کام اور ملازمت دیتے وقت دوسرے لوگوں کی مجبوریوں کو تلاش کر کے ان کو بھنانے کی کوشش نہ کریں، ان کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کریں۔ بلکہ ان کے سامان اور ان کے کام کی مناسب اور واجبی قیمت ادا کریں۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ان کی ضرورتوں کو سمجھیں، ان کی زندگی کے حالات کو نگاہ میں رکھیں اور ان کے گھروں کی پریشانیوں کو سمجھیں۔

اب ذیل میں ہم دو واقعات بیان کرتے ہیں[9] جس میں اصل اسلامی معاشرے کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔

ایک گھر کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ دروازے کے باہر ایک عورت کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سبزیوں کا تھیلا تھا۔ وہ آواز لگا رہی تھی: ''سبزی لے لو، سبزی۔'' اس کے پاس دو تین طرح کی سبزیاں تھیں۔ ان سب کا وزن تین کلو ہو گا۔

سفیان کی نانی نے جب اس کی آواز سنی وہ اس کے پاس پہنچ گئیں۔

انہوں نے سبزی والی سے کہا: یہ ساری سبزیاں کتنے میں دو گی؟

اس نے جواب دیا: بیس روپے میں۔

نانی نے کہا: دس روپے میں دے دو۔

وہ پندرہ روپے میں دینے کے لیے تیار ہو گئی۔ ان کی ان باتوں کے درمیان

(۹) یہ واقعات حقیقی ہیں، کوئی تمثیلی کہانیاں نہیں ہیں، ہم نے ان واقعات میں اصل ناموں کو بدل کر پیش کیا ہے۔

سفیان بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے سبزی والی عورت کو غور سے دیکھا۔ اس کے تھیلے میں جو سبزیاں تھیں ان کو بھی غور سے دیکھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ بازار میں اتنی سبزیاں کم سے کم چالیس روپے کی ملیں گی۔ ساتھ ہی اس نے سبزی والی عورت کی پیشانی اور اس کے چہرے پر مایوسی، شکستگی اور پریشانی کے آثار کو بھی پڑھ لیا۔ اس نے اپنی جیب سے ۸۰ روپے نکال کر اس سبزی والی کو دے دیے۔

نانی نے کہا: بیٹا پیسے مفت میں آتے ہیں کیا؟ تو نے بلا وجہ اتنے پیسے کیوں دے دیے؟

سفیان نے کہا: میں نے بلا وجہ نہیں دیے۔ مجھے ایک نہیں، کئی وجہیں نظر آئیں اس کو یہ پیسے دینے کے لیے۔

نانی !اگر آپ یہ سبزیاں بازار سے خریدیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کی اصل قیمت کم سے کم چالیس روپے ہے۔ آپ کو نہیں لگتا کہ یہ عورت کچھ پریشان سی ہے اور اس کو کچھ پیسوں کی اشد ضرورت ہے۔ اور اسی وجہ سے یہ چالیس روپے کا سامان پندرہ روپے میں دینے کے لیے راضی ہوگئی۔ میں نے چالیس روپے اسے اس کی سبزیوں کے دیے ہیں۔ اور پھر چونکہ یہ کچھ پریشان سی دکھائی دیتی ہے اس لیے چالیس روپے اور دیے تاکہ یہ اپنی ضرورت کو پورا کرلے اور اس کی پریشانی ختم ہوجائے۔ یہ ہماری اسلامی بہن ہے۔ اس کی پریشانی کو سمجھنا اور اس کو دور کرنا ہم سب کی اسلامی ذمہ داری ہے۔

نانی نے مسکرا کر کہا: تو ٹھیک کہتا ہے بیٹا۔

پھر ایک دن سفیان نے بازار میں ایک بوڑھی عورت کو خوبصورت ڈلیائیں بیچتے ہوئے دیکھا۔ اس نے وہ ڈلیائیں زمین پر ایک چادر کے اوپر رکھی ہوئی تھیں۔ وہ اس عورت کے قریب گیا۔

اس نے عورت سے پوچھا: آپ ایک ڈلیا کتنے روپے میں بیچ رہی ہیں؟

بوڑھی عورت نے جواب دیا: ایک سو پچاس روپے میں دو۔

سفیان نے پوچھا: آپ کو ایک ڈلیا بنانے میں کتنا وقت لگتا ہے؟

عورت نے جواب دیا: دو دن لگتے ہیں۔

سفیان نے کہا: اس حساب سے آپ کی دو ڈلیاؤں کی قیمت پانچ سو روپے بھی بہت کم ہے۔ آپ کو اپنی ڈلیائیں اتنی سستی نہیں بیچنا چاہیے۔

بوڑھی عورت نے بڑا مایوس ہوتے ہوئے جواب دیا: بیٹا! لوگ اتنے پیسے بھی بڑی مشکل سے اور بہت بھاؤ تاؤ کرنے کے بعد دیتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ تو سو روپے میں ہی لے جانا چاہتے ہیں۔

اسے بوڑھی عورت کے لہجے میں مایوسی کو دیکھ کر کافی تکلیف ہوئی۔ لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا؟

اس نے بوڑھی عورت سے کہا: اللہ بہتر کرے گا۔ اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

آگے بڑھتے ہوئے وہ من ہی من میں کہہ رہا تھا کہ آج کل تو وہ مزدور جن کے پاس نہ تعلیم ہے اور نہ تربیت ان کو بھی ایک دن کے کام کے پانچ سو روپے مل جاتے ہیں۔ دنیا سودے بازی اور بھاؤ تاؤ کے نشہ میں اتنی بدمست کیوں ہوگئی کہ وہ یہ بھی بھول گئی کہ یہ ڈلیائیں مزدوری سے نہیں بلکہ ہنر سے بنتی ہیں۔ دو ڈلیاؤں کو بنانے میں چار دن خرچ ہوتے ہیں۔ لوگوں سے اس بوڑھی عورت کی ڈلیاؤں کی قیمت اس کے ہنر کی بنیاد پر دینے کی امید تو کیا کی جاسکتی ہے، وہ تو اس کی مزدوری کی قیمت بھی دینے کو تیار نہیں ہیں۔

بالکل درست کہا سفیان نے اپنے من میں کہ لوگ تو اس کی مزدوری کی قیمت دینے کو تیار نہیں ہیں وہ اس کے ہنر کی قیمت کیا دیں گے؟ اور پھر ان لوگوں سے یہ امید کرنا تو

خود کو دھوکہ دینے کے برابر ہے کہ وہ اس کے کام کی وہ قیمت دیں گے جو قیمت ایک "اسلامی سماج" میں اس عورت کے کام کی ہونی چاہیے۔ کاموں کی "اسلامی قیمت" کیا ہونی چاہیے اس کو ہم نے ایک الگ سیکشن میں بیان کیا ہے۔

ایک غلام جس کی مارکیٹ میں بولی لگتی ہے

امام اور کسی بھی عالم دین، فاضل، مفتی دین متین یا مدرسے کے مدرس کے بارے میں یہ تو کم سے کم ہمیں ضرور اپنی نگاہ میں رکھنا چاہیے کہ دین کے ان خادموں کے پیچھے بھی ایک گھر ہوتا ہے۔ ان کے اوپر اس گھر کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس گھر میں بیوی، بچے، والدین، دادی، دادا، بھائی بہنیں سب ہوتے ہیں۔ یہ ایک پورا گھر اور فیملی ہوتی ہے، بالکل اسی طرح جس طرح ہم سب کے گھر اور فیملیاں ہوتی ہیں۔ اور یہ سب کھاتے پیتے بھی ہیں۔ کپڑے بھی پہنتے ہیں۔ آنے والے ہر تہوار یا کسی اور خاص موقع پر وہ بھی اور دنوں کے مقابل کچھ زیادہ اچھا پہننا اور کھانا پینا چاہتے ہیں۔ پھر ان کے پڑوسی، رشتہ دار اور دوست واحباب بھی ہوتے ہیں۔ یہ ان کے گھروں میں آنا جانا پسند کرتے ہیں اور وہ لوگ ان کے گھر آنا جانا پسند کرتے ہیں۔

ان کے گھروں کے بچے تعلیم حاصل کرنا بھی چاہتے ہیں اور معیاری تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور آج کے زمانے میں دینی اور دنیوی دونوں طرح کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کام کے لیے ان کی کتابیں اور نوٹ بکس (Notebooks) بھی آنا ہوتی ہیں۔ اسٹیشنری (Stationary) کے سامانوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ہر مہینے ان کی

فیسیں بھی ادا کرنا ہوتی ہیں۔ اور ایسا نہیں کہ یہ سب سامان ایک بار خرید لیے اور بس۔ ان سامانوں کو تقریبا ہر چھ مہینے میں نئے سامانوں سے بدلنا ہوتا ہے۔ ان کے گھروں میں بھی شادیاں ہوتی ہیں اور نئے رشتے بنتے ہیں۔ ان نئے رشتوں کو قائم کر کے اسی طرح نہیں چھوڑ دیا جاتا بلکہ ان کو برقرار رکھنا، ان کی حفاظت کرنا بلکہ ان کو مضبوط سے مضبوط تر بنانا ہوتا ہے جس کے لیے وقت اور پیسہ دونوں درکار ہوتے ہیں۔

ان کے گھروں میں بھی وقتاً فوقتاً بچے اور بڑے سب بیمار ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے علاج کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جیسے سب لوگوں کی زندگی میں ہوتا ہے ان کی زندگی میں بھی اچانک ایسے حادثے ہو جاتے ہیں جو اندر سے باہر تک پورے گھر کو توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ ان حادثوں کے بھیانک نتائج سے باہر نکلنے کے لیے اچھی رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ بیماریاں اور اس قسم کے حادثے نہ صرف جذبات اور نفسیات پر ایک حملہ ہوتے ہیں بلکہ ساتھ میں ایک اچھی خاصی خطیر رقم کو بھی بہا لے جاتے ہیں۔ اور اگر رقم موجود نہ ہو تو پھر انسانوں کو ساتھ میں لے جاتے ہیں۔ اور یہ بات ہم سب کو معلوم ہے کہ اس طرح کے حادثے ضروری نہیں ہے کہ ایک ہی بار پیش آئیں وہ کئی بار بھی پیش آسکتے ہیں۔

لیکن ہمیں ان تمام چیزوں سے کیا مطلب؟ کیونکہ ہم نے اماموں اور علما کو مارکیٹ میں بولی لگا کر بکنے والا ایک غلام بنا دیا ہے۔ ہم تمام ائمہ اور علما سے سودے بازی اور سوداگری کی زبان میں بات کرتے ہیں۔ ہم ان سے ان کی اجرت کے بارے میں ان کی رائے معلوم کرتے ہیں کہ وہ کتنے روپے مہینہ میں مسجد میں امامت کرنے یا مدرسے میں تعلیم دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ وہ اپنی رائے بتا دیتے ہیں اور پھر ہم انہیں اپنی رائے بتاتے ہیں۔

جب ہم اماموں سے ان کی تنخواہ یا اجرت کے بارے میں ان کی رائے پوچھتے ہیں

تو اس سے ہمارا اصل مقصد ان کی رائے کو جاننا اور سمجھنا نہیں ہوتا ہے کیونکہ ہمارے دماغ میں یہ پہلے سے ہی طے ہوتا ہے کہ ان کو چھ ہزار روپے دینا ہیں۔ مانیں تو ٹھیک اور نہ مانیں تو اس دنیا میں اماموں کی کمی تھوڑی ہے۔ اپنی رائے ان کو بتانے اور ان کی رائے معلوم کرنے کے پیچھے ہمارا مقصد یا تو امام یا عالم دین کو آسانی سے منانا اور راضی کرنا ہوتا ہے۔ یا ہم ان سے ان کی رائے صرف اس لیے پوچھتے ہیں تاکہ ہم لوگوں کو یہ بتا سکیں کہ امام صاحب یا عالم دین کو مسجد یا مدرسے میں اتنے کم پیسوں میں ان کی مرضی سے رکھا گیا ہے۔ ان کے ساتھ کوئی زور زبردستی نہیں کی گئی ہے۔

مسجد میں امامت کے لیے یا مدرسے میں تعلیم دینے کے لیے تقرری سے پہلے مقتدیوں اور امام صاحب، یا مدرسے کے ناظم اور عالم دین کے درمیان سودے بازی میں ایک بات تو طے ہے کہ جیت ہم مقتدیوں کی یا مدرسے کے ناظم کی ہوتی ہے۔ کیونکہ مجبور امام یا عالم دین ہیں۔ ہم مجبور نہیں ہیں۔ اور ناظم بھی مجبور نہیں۔ اور ہم ان کی اس مجبوری کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر یہ امام یا عالم دین راضی نہیں ہوں گے تو دوسرے بہت آئیں گے۔ اگر ان کو ہمارا سودا مناسب لگتا ہے تو ٹھہریں ورنہ کوئی اور جگہ دیکھیں۔ ہمارے پاس "اماموں، مولویوں، علما اور مفتیوں" کی کوئی کمی تھوڑی ہے۔ یہ لوگ روزانہ ہمارے اردگرد بھٹکتے پھرتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک چھوڑ کر جائے گا ہمیں دوسرے ہزاروں مل جائیں گے۔ اور وہ بھی اس سے کم تنخواہ میں۔ بلکہ اگر ہم چاہیں تو دوسرا، تین ہزار روپے میں بھی مل جائے گا۔

دوسری طرف ائمہ اور علما واقعی مجبور ہوتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر وہ چھ ہزار روپے میں راضی نہ ہوں تو دوسری جگہ کونسے ان کو چھ ہزار روپے سے زیادہ مل جائیں گے۔ اس لیے وہ تھوڑی بہت دیر جدوجہد کرتے ہیں اور اس کے بعد ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ لیکن

مجبور اس وجہ سے نہیں کہ ان کا عہدہ یا منصب اب کمزور ہوگیا، ان کا مقام پہلے کی طرح مضبوط، مقدس اور عظیم الشان نہ رہا۔ یا ائمہ اور علما کا علم اب بے قیمت ہوگیا۔ یا ان کا بدن اور جسم کمزور ہوگیا۔ ان کو مجبور اور بے بس ہم لوگوں نے بنایا ہے۔ وہ مجبور ہمارے کردار اور ہمارے رویے کی وجہ سے ہوئے ہیں۔ ہم نے ان کے ہاتھ پاؤں میں زنجیریں اور بیڑیاں ڈالی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم نے ائمہ اور علما کو اس حد تک مجبور کردیا ہے کہ اگر تمام مسجدوں اور مدرسے والے یہ فیصلہ کرلیں کہ ہم کسی بھی امام کو یا عالم دین کو دو یا تین ہزار روپے مہینے سے زیادہ نہ دیں گے تب بھی ہار ائمہ اور علما کی ہی ہوگی۔ اوران کو سرینڈر (Surrender) کرنا ہی ہوگا۔ کیونکہ ان کے پاس دوسرا کوئی اور آپشن نہیں ہے۔

انہوں نے اپنے دین کی خدمت کے عشق اور اس کی تبلیغ واشاعت کی محبت میں دین کی خدمت سے جڑے کاموں کے علاوہ نہ کبھی کچھ سیکھا اور نہ کبھی اس کے بارے میں سوچا۔ انہیں کوئی دوسرا کام آتا ہی نہیں۔ وہ یہی کام کرنے کے لیے مجبور ہیں جو وہ کرتے آئے ہیں۔ ہم ان کے ساتھ چاہے جتنے بھی کم پیسوں میں سودا کریں وہ اس کو ماننے کے لیے مجبور ہیں۔ اور ہم عوام اور ہم مقتدی ان کی اس مجبوری کا سالہا سال سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں اور جیسا کہ حالات بتارہے ہیں آگے بھی ان کی اس مجبوری کا فائدہ اسی طرح اٹھاتے رہیں گے۔ بلکہ ان کی اس مجبوری کو اور بھی زیادہ گہرا کریں گے۔

ہم جانتے ہیں وہ مجبور ہے

ہم نے دراصل ائمہ اور علما کو نہ صرف مجبور کیا بلکہ ہم اس بات کو اچھی طرح سمجھ بھی چکے ہیں کہ وہ مجبور ہو چکے ہیں۔ ہم جانتے ہیں: وہ کہاں جائیں گے؟ جائیں گے بھی تو پلٹ کے واپس ہمارے پاس ہی آئیں گے۔

جو بات ہم کو سمجھ میں نہیں آتی وہ یہ ہے کہ ان کے علم، ان کے ہنر، ان کی تربیت، ان کے عہدے اور ان کے منصب کی واجبی اور مناسب قیمت کیا ہے؟ اور نہ ہی ہم اِس بات کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ دوسری باتیں جو ہم کو سمجھ میں نہیں آتیں وہ یہ ہیں کہ:

- ہمارے ائمہ اور علما کی ضروریات کیا ہیں؟
- ان کے گھر کے حالات کیا ہیں؟
- ان کا وہ گھر جو ہماری نظروں کے سامنے نہیں ہے، بلکہ وہ کوسوں دور ہے جس کے سچے حالات ہمیں کبھی معلوم نہیں ہو سکتے، اس میں کھانا بن بھی پاتا ہے یا نہیں؟ اور بنتا بھی ہے تو کیسا بنتا ہے؟ کیا ایسا ہی بنتا ہے جیسا ہم سب کے گھروں میں بنتا ہے؟
- یا بس ایسا کہ دن کٹ جاتا ہے؟
- کیا ان کے گاؤں میں ان کے بچوں کی شادیاں ہو چکی ہیں یا نہیں؟
- اور اگر نہیں ہوئیں ہیں تو کیا امام صاحب اتنی سکت رکھتے ہیں کہ وہ ان کی شادیاں کر پائیں گے؟
- کیا ان کے بچے تعلیم حاصل کر پاتے ہیں یا نہیں؟ کیا ان کے پاس اتنی قوت ہے کہ

وہ اپنے بچوں کو معقول ادارے میں تعلیم دلوا پائیں یا نہیں؟

- ان کی زندگی کیسے چلتی ہے؟
- اور کیا چلتی بھی ہے یا نہیں؟
- کسی موڑ پہ آکر پھنس تو نہیں گئی ہے؟

اور وہ بھی کسی ایسی جگہ جہاں ان کی کوئی سننے والا ہی نہیں ہے۔ بس ایک سنسان جنگل ہے جہاں ان کی سسکیاں تو کیا ان کی چیخ کی آواز بھی کوئی نہیں سن سکتا۔ ہم یہ تو جانتے ہیں کہ ان کے کرتے کا رنگ سفید ہے لیکن یہ نہیں جانتے کہ ان کے گھر کی دنیا میں سیاہی اور اندھیرے کے سوا کچھ نہیں۔ اور نہ ہی ہم ان کی باتوں کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ اور نہ سننا چاہتے ہیں۔

بازار میں کچھ تو انصاف ہے

ہم یہاں کسی بھی ملک کے قانون کی بات نہیں کریں گے، کیونکہ ضروری نہیں ہے کہ ملکی قوانین نے مختلف قسم کے کام کرنے والوں اور خدمات انجام دینے والوں کے لیے جو اجرت مقرر کی ہو وہ پوری طرح انصاف پر مبنی ہو۔ پھر قانون کے ساتھ ایک مسئلہ اور بھی ہے۔ مثال کے طور پر ایک ملک میں مختلف قسم کے کام کرنے والوں اور خدمات انجام دینے والوں کے لیے ۲۰۰۰ء میں ایک قانون بنایا گیا جس میں ان کے لیے پندرہ ہزار روپے اجرت یا تنخواہ مقرر کی گئی۔ اور وہ قانون اس وقت کے اعتبار سے انصاف پر مبنی تھا۔ لیکن پھر کچھ سالوں میں حالات بدل گئے، مثلاً مہنگائی بڑھ گئی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ۲۰۰۰ء میں جو تنخواہ مقرر کی گئی تھی اس کی حیثیت ۲۰۱۰ء میں بہت زیادہ کم ہوگئی۔ یہاں تک کہ آدھے سے

بھی زیادہ کم ہو گئی۔ مثلاً پندرہ ہزار روپے کی حیثیت صرف سات ہزار رہ گئی۔ ظاہر ہے ۲۰۱۰ء میں پہنچ کر یہ قانون انصاف پر مبنی نہیں رہا۔ ۲۰۱۰ء میں ان کی اجرت کو بڑھانا ضروری ہو گیا۔ اس طرح بہت سے قانون وقت گزرنے کے ساتھ فرسودہ، ناکارہ بلکہ نقصاندہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ قوانین کو بدلنا اور ان کو اپ ڈیٹ کرنا آسان نہیں ہوتا اس لیے ایسے قوانین سالوں تک ـــــ لوگوں کو نقصان پہنچاتے رہتے ہیں اور ان کی کوئی خیر خبر نہیں لیتا۔

ہاں ہم یہ ضرور دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ شریعت کے نظریے سے کسی بھی کام کرنے والے کی کم سے کم اجرت کتنی ہونا چاہیے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم اس معاملے میں شریعت کے احکام جانیں ہم یہ معلوم کریں گے کہ فی الوقت بازاروں میں کاموں کی اجرتیں اور تنخواہیں اوسطاً کیا ہیں؟ ہم کسی بھی قسم کے کاموں کو خواہ وہ دنیوی ہوں یا دینی چار الگ الگ خانوں میں رکھ سکتے ہیں۔

(۱) کچھ کام وہ ہیں جن کو کرنے کے لیے نہ تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ تربیت کی۔ جیسے ان لوگوں کا کام جو تعمیری کاموں میں مزدوری کرتے ہیں اور معماروں (تعمیری کام کے مستریوں) کو سہارا دیتے ہیں۔

(۲) دوسری طرف کچھ کام وہ ہیں جن کو کرنے کے لیے صرف تربیت کی ضرورت ہوتی ہے، تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ جیسے تعمیر کا کام جو معمار کرتے ہیں۔ ظاہر ہے اس کام کے لیے صرف تربیت کی ضرورت ہے، علم کی ضرورت نہیں ہے۔

(۳) تیسرے نمبر پر وہ کام آتے ہیں جن کو کرنے کے لیے تعلیم اور تربیت دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے کسی کمپنی میں کلرک یا منشی کا کام۔

(۴) اور پھر کچھ کام ایسے ہیں جن کو کرنے کے لیے صرف تربیت اور تعلیم کی

ضرورت نہیں ہوتی ہے ،بلکہ اچھی قسم کی تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے۔ مثلاً کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ٹیچرز، بینکوں کے مینیجرس وغیرہ۔ امامت اور مدرسے میں تعلیم دینے کے کام اسی چوتھی قسم میں آتے ہیں۔ کیونکہ امامت اور تدریس دونوں ہی کے لیے نہ صرف تعلیم و تربیت کی بلکہ اچھی خاصی مشق و تربیت اور اچھے علم کی ضرورت ہوتی ہے۔

جب ہم بازار میں دی جانے والی اجرتیں اور تنخواہیں دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جن کاموں کے کرنے کے لیے نہ تربیت کی ضرورت ہے اور نہ ہی تعلیم کی ان کی ایک دن کی اجرت بھی کم سے کم پانچ سو روپے ہے۔ اگر مسجد کے امام کو یا مدرسے کے مدرس کو ایک جاہل، بے پڑھا لکھا اور بغیر تربیت اور بغیر تعلیم والا مزدور ہی مان لیا جائے تب بھی تو اس کے پندرہ ہزار روپے مہینے کے بنتے ہی ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ امام اور مدرس دونوں ہی نہ صرف یہ کہ وہ تربیت یافتہ ہوتے ہیں بلکہ تعلیم یافتہ بھی ہوتے ہیں۔ اور نہ صرف یہ کہ ان کے پاس تعلیم و تربیت ہوتی ہے بلکہ ان کے پاس اچھی قسم کی تعلیم و تربیت ہوتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ ایک مزدور صرف آٹھ گھنٹے کام کرتا ہے، جبکہ مسجدوں کے امام اور مدرسوں کے مدرس ایک طرح سے چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی کرتے ہیں۔ در اصل وہ نہ صرف چوبیس گھنٹے کام کرتے ہیں بلکہ ہفتے کے سات دن، مہینے کے تیس دن اور سال کے تین سو پینسٹھ دن کام کرتے ہیں۔ ہم نے ان کے لیے کوئی چھٹی نہیں رکھی ہے۔ اگر امام صاحب ہفتے میں ایک دن چھٹی کرلیں تو پوری بستی میں کہرام مچ جائے کہ امام صاحب لاپرواہ ہیں۔ اور اگر مدرسے کے عالم دین ایک دن کے چھٹی کرلیں تو ان کے واپس آنے سے پہلے ان کو مدرسے سے نکالنے کے منصوبے تیار ہوجائیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک مزدور کو ہم اس کے دنیوی کام کے لیے پندرہ ہزار روپے ماہانہ اجرت دیتے ہیں اور وہ بھی اس کے

آٹھ گھنٹوں کے کام کے لیے۔ لیکن مسجد کے امام یا مدرسے کے مدرس کو ہم ان کی دینی خدمات کے لیے چھ ہزار روپے سے زیادہ دینے کو تیار نہیں ہیں، جبکہ ان کے پاس تعلیم بھی ہے اور تربیت بھی ہے، اور نہ صرف تعلیم و تربیت ہے بلکہ اچھی تعلیم و تربیت ہے اور جبکہ وہ ایک طرح سے چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی انجام دیتے ہیں۔ کیا ہم یقین سے اس بات کو کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہم انصاف کر رہے ہیں۔ ہم یہ بھول تو نہیں گئے ہیں کہ وہ خدا جو ہمارا خدا ہے وہ اماموں، مدرسوں، عالموں، فاضلوں اور مفتیان دین کا بھی خدا ہے۔ کیا ہم نے اس بات کو بھلا تو نہیں دیا کہ خدا ظلم کا بدلہ ضرور لیتا ہے دنیا میں نہ سہی تو آخرت میں ضرور۔

اسلام کی عظیم سوچ

اسلام میں ہر امیر مسلمان پر زکوٰۃ فرض کی گئی ہے۔ زکوٰۃ کو فرض کیے جانے کے پیچھے بہت سارے مقاصد ہیں۔ ان میں سے ایک عظیم مقصد معاشرے سے غربت کو ختم کرنا بھی ہے۔ جب کسی فرد کے پاس اس کی بنیادی ضروریات سے الگ ساڑھے سات تولے سونا یا اس کی قیمت کے برابر چاندی یا پیسے یا کوئی اور قسم کا مال یا پراپرٹی (Property) اکٹھا ہو جائے اور اس پر ایک سال گذر جائے تو اس کے اوپر زکوٰۃ فرض ہو جاتی ہے۔ اور اس پر بنیادی ضروریات سے زیادہ اس سونے، چاندی، پیسوں، مال یا پراپرٹی میں سے سالانہ ڈھائی فیصد حصہ غریبوں کو دینا فرض ہو جاتا ہے۔ [10] اسلام میں ہر اس آدمی کو غریب شمار کیا

---

(۱۰) ہمارے زمانے میں جو اصول ہے وہ یہ ہے کہ چاہے ایک شخص کے پاس ساڑھے سات تولے سونا یا اس کے برابر مال یا پیسہ ہو یا ساڑھے ۵۲ تولے چاندی یا اس کے برابر مال یا پیسہ ہو، دونوں میں سے کوئی بھی ہو اس پر زکوٰۃ فرض ہو جاتی ہے۔ اس اصول کو تبدیل کیے جانے کی ضرورت ہے۔ زمانۂ نبوی میں ساڑھے سات تولے سونے اور ساڑھے ۵۲ تولے چاندی کی مالیت ایک ہی تھی، اس لیے اس وقت یہ مناسب تھا کہ ایک شخص کے

جاتا ہے جس کے پاس اپنی بنیادی ضروریات سے الگ ساڑھے سات تولے سونا، یا اس کی قیمت کے برابر چاندی، پیسے، مال یا پراپرٹی نہ ہو۔ دوسری جانب اسلام میں امیر وہ شخص ہے جس کے پاس اس کی بنیادی ضروریات سے زیادہ ساڑھے سات تولے سونا، یا اس کی قیمت کے برابر چاندی، پیسے، مال یا پراپرٹی ہو۔ بس یہی ایک سادہ فرق ہے ایک امیر اور غریب کے درمیان اسلام میں۔

امیروں کی ذمہ داری ہے اور ان پر فرض ہے کہ وہ اپنی بنیادی ضروریات سے زائد مالیت کا ڈھائی فیصد حصہ سالانہ غریبوں کو دیں۔ اور ظاہر ہے قرآن اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امیروں کو اپنے مال کا ڈھائی فیصد غریبوں کو دینے کی تاکید اس لیے فرمائی کہ اللہ ورسول عزوجل وصلی اللہ علیہ وسلم چاہتے ہیں کہ سماج میں کوئی غریب نہ رہے۔

سماج میں کوئی غریب نہ رہے کا مطلب ہے کہ سماج میں کوئی آدمی ایسا نہ رہے جس کے پاس ساڑھے سات تولے سونے یا اس کی قیمت (Value) سے کم مالیت یا مال ہو۔ کیونکہ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے اسلام میں ہر اس آدمی کو غریب شمار کیا جاتا ہے جس کے پاس اپنی بنیادی ضروریات سے الگ ساڑھے سات تولے سونا، یا اس کی قیمت کے برابر چاندی، پیسے، مال یا پراپرٹی نہ ہو۔

اس سے ہمیں یہ پیغام ملتا ہے کہ ہم تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ ہم دوسرے تمام مسلمانوں کو غربت سے نکالنے کے بارے میں سوچا کریں۔ ہم کوشش کیا کریں

پاس دونوں میں سے کوئی بھی نصاب ہو اس پر زکوٰۃ فرض ہو جائے۔ لیکن ہمارے وقت میں چوں کہ سونے اور چاندی کے نصابوں کے درمیان فرق کافی زیادہ بڑھ چکا ہے اس لیے مناسب یہ ہے کہ چاندی کے نصاب کا اعتبار سونے کے نصاب سے کیا جائے۔ یعنی اصول یہ ہونا چاہیے کہ اگر کسی کے پاس ساڑھے سات تولے سونا ہے یا اس کی مالیت کی برابر چاندی ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض ہے، یہ نہیں کہ جس کے پاس ساڑھے ۵۲ تولے چاندی یا اتنی مالیت کا کوئی اور مال ہے اس پر بھی زکوٰۃ فرض ہے۔

کہ ہمارے معاشرے میں ہر ہر فرد کم سے کم اتنا محفوظ اور مضبوط ضرور ہونا چاہیے کہ اس کے پاس ہمیشہ کم سے کم اتنی مالیت ہو کہ وہ ساڑھے سات تولے سونے کی قیمت کے برابر ہو۔

اس طرح سے اگر چہ دوسرے مسلمان ہمارا کچھ کام نہ کر رہے ہوں، ہماری کسی قسم کی مدد نہ کر رہے ہوں اور ہمارے یہاں کسی طرح کی مزدوری نہ کر رہے ہوں تب بھی ہماری یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم اس بات کو یقینی بنائیں کہ ہر مسلمان کے پاس ہر وقت کم از کم ساڑھے سات تولے سونے کے برابر مالیت یا مال ہو۔ اس طرح سے یہ ہماری اسلامی، شرعی اور سماجی ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم مسلمان آپس میں ایک دوسرے کو (یعنی ہم میں کے امیر لوگ ہم میں کے غریب لوگوں کو) کم سے کم اتنا دیں کہ ہر ایک کے پاس کم از کم ساڑھے سات تولے سونے کی برابر مالیت ہو اور وہ بھی بغیر کسی عوض کے۔ بغیر عوض کے اس لیے کہ یہ خالص اسلامی، شرعی اور سماجی ذمہ داری ہے، یہ کسی چیز کا بدلہ نہیں ہے۔

اس بات کو ہم اس طرح سمجھتے ہیں کہ آج جس وقت ہم یہ لکھ رہے ہیں ایک تولہ سونے کی قیمت تقریباً پچاس ہزار روپے ہے۔ اس حساب سے آج ساڑھے سات تولے سونے کی قیمت تین لاکھ پچھتر ہزار روپے ہے۔ یعنی مذہب اسلام کی منشا یہ ہے کہ ایک مسلمان کے پاس ایک سال کے لیے کم از کم تین لاکھ پچھتر ہزار روپے ہونا چاہیے۔ ہاں جس مسلمان کے پاس بھی اتنی مالیت یا پیسے ہو جائیں تو وہ پھر دوسرے ایسے لوگوں کو تلاش کرے جن کے پاس اتنی مالیت یا پیسے نہیں ہیں اور اپنی مالیت میں سے ڈھائی فیصد ان کو دے یہاں تک کہ ان کے پاس بھی اتنی مالیت ہو جائے۔

اس رقم کو اگر ہم سال کے بارہ مہینوں پر تقسیم کریں تو ایک مہینے کے اکتیس ہزار دو سو پچاس روپے بنتے ہیں۔ یعنی اسلام کی منشا یہ ہے کہ ہر مسلمان کے پاس ایک مہینے کے لیے کم سے کم اکتیس ہزار دو سو پچاس روپے ہونا چاہیے۔ ایک طرح سے ایک مکمل اسلامی

معاشرہ وہ ہے جس میں ہر مسلمان کے پاس ایک مہینے کے لیے کم سے کم اکتیس ہزار دو سو پچاس روپے ہوں۔اتنی مالیت تو ہر مسلمان کے پاس ہر مہینے کے لیے اس وقت ہونی چاہیے جب وہ کسی کے لیے کوئی کام نہ کررہا ہو۔کیونکہ اتنی مالیت کا ہر مسلمان کے پاس ہر مہینے کے لیے یقینی بنانا یہ تو ہم مسلمانوں کی خالص اسلامی، شرعی اور سماجی ذمہ داری ہے، یہ ذمے داری کسی چیز کے بدلے میں نہیں ہے۔یہ ہر مسلمان کا "بنیادی اسلامی حق" ہے۔جب یہ ذمے داری اس وقت ہے جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے کوئی کام نہ کررہا ہو۔تو پھر اگر:

(۱) دوسرا مسلمان ہمارے لیے کوئی کام کررہا ہو، ہمارے یہاں کوئی مزدوری کررہا ہو یا کوئی خدمت انجام دے رہا ہو، تو اس کے لیے بطور مسلمان ہماری ذمہ داری کیا بنے گی؟ پھر یہ تو اس وقت ہے جب وہ ہمارے لیے کوئی ایسا کام کررہا ہو جس کام کو کرنے کے لیے نہ تو تربیت اور مشق کی ضرورت ہو اور نہ ہی تعلیم حاصل کرنے کی۔

(۲) لیکن اگر وہ ہمارے لیے کوئی ایسا کام کررہا ہو کہ اس کام کو سیکھنے کے لیے اسے تربیت اور مشق کی ضرورت پڑی ہو تو اس کے لیے بطور مسلمان ہماری ذمہ داری کیا بنے گی؟

(۳) اس سے بھی آگے اگر وہ ہمارے لیے کوئی ایسا کام کررہا ہو کہ اس کام کو کرنے کے لیے تربیت اور مشق کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے کی بھی ضرورت ہو تو اس کے لیے بطور مسلمان ہماری ذمہ داری کیا بنے گی؟

(۴) پھر اس سے بھی آگے اگر وہ ہمارے لیے کوئی ایسا کام کررہا ہو کہ اس کام کو کرنے کے لیے نہ صرف تربیت اور مشق کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت ہو بلکہ اچھی تربیت اور اچھی تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت ہو تو اس کے لیے بطور مسلمان ہماری

ذمہ داری کیا بنے گی؟

چلیے اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک مسجد کے امام صاحب یا ایک عالم دین یا مفتیٔ دین جو مدرسے میں تعلیم دیتے ہیں ہمارے لیے کس قسم کا کام کرتے ہیں یا کس قسم کی خدمت انجام دیتے ہیں؟ ہم نے کاموں کی یہ قسمیں بیان کیں۔

(۱) وہ کام جن کو کرنے کے لیے نہ تربیت کی ضرورت ہے اور نہ تعلیم کی۔

(۲) وہ کام جن کو کرنے کے لیے صرف تربیت کی ضرورت ہے۔

(۳) وہ کام جن کو کرنے کے لیے تربیت اور تعلیم دونوں کی ضرورت ہے۔

(۴) وہ کام جن کو کرنے کے لیے نہ صرف تربیت اور تعلیم کی ضرورت ہے بلکہ اچھی تربیت اور اچھی تعلیم کی ضرورت ہے۔

ظاہر ہے مسجدوں کے اماموں اور مدرسوں کے علما اور مفتیان کرام کے کام ان میں سے سب سے آخری قسم میں آتے ہیں۔ یعنی امامت اور تعلیم دینے کے لیے نہ صرف تربیت اور تعلیم کی ضرورت ہے، بلکہ اچھی تربیت اور تعلیم کی ضرورت ہے۔ پھر جب ہماری اسلامی، شرعی اور سماجی ذمہ داری یہ ہے کہ ہم اس وقت بھی جب دوسرے مسلمان ہمارے لیے کوئی کام نہ کرتے ہوں اس بات کو یقینی بنائیں کہ ہر مسلمان کے پاس ہر مہینے کے لیے کم از کم اکتیس ہزار دو سو پچاس روپے ہوں تو پھر ایک امام یا ایک عالم دین جو مدرس ہیں جو

(۱) نہ صرف ہمارے لیے کام کرتے ہیں۔

(۲) بلکہ ایسا کام کرتے ہیں جس کے لیے تربیت کی ضرورت ہے۔

(۳) اور نہ صرف تربیت کی ضرورت ہے بلکہ تعلیم کی ضرورت ہے۔

(۴) اور نہ صرف تربیت اور تعلیم کی ضرورت ہے بلکہ اچھی تربیت اور تعلیم کی ضرورت ہے۔

(۵) اور نہ صرف وہ ہمارے لیے ایسا کام کرتے ہیں جس کے لیے اچھی تربیت اور تعلیم کی ضرورت ہے بلکہ ان میں بھی وہ ہمارے لیے ایسا کام کرتے ہیں جو ایک دینی، اسلامی، شرعی اور اللہ ورسول عزوجل وصلی اللہ علیہ وسلم کی رضا وخوشنودی کا کام ہے اور ان کے دین معظم کی خدمت کا مقدس ترین کام ہے۔

تو پھر ان کے لیے ہماری اسلامی، شرعی اور سماجی ذمہ داری کیا بنے گی؟

اگر ہم ان لوگوں کو جو ہمارے لیے کسی قسم کا کام کرتے ہیں ان کا "بنیادی اسلامی حق" (یہ کہ ہر مسلمان کے پاس ہر مہینے کے لیے کم ازکم اکتیس ہزار دوسو پچاس روپے ہوں) ایک اسلامی اور سماجی ذمے داری کے طور پر نہیں دے سکتے تو ان کا یہ حق ہم انہیں ان کے اس کام کے بدلے میں تو دے ہی سکتے ہیں جو وہ ہمارے لیے کرتے ہیں، خصوصاً ان لوگوں کو جو ہمارے لیے ہمارا دینی کام کرتے ہیں اور دینی کام بھی وہ ایسا کرتے ہیں جس کو کرنے کے لیے اچھی تعلیم اور اچھی تربیت ومشق کی ضرورت ہے۔

اب اگر یہ اصول سمجھ میں آگیا تو اس سے یہ نتیجہ آسانی سے نکالا جاسکتا ہے کہ ایک اسلامی معاشرے میں کسی بھی کام کرنے والے کی کم ازکم ماہانہ تنخواہ اس وقت کے اعتبار سے جس وقت میں یہ لکھ رہا ہوں کم ازکم اکتیس ہزار دوسو پچاس روپے تو ہر حال میں ہونی چاہیے۔ اور اتنی تنخواہ تو اس کام کرنے والے کے لیے ہونی چاہیے:

- جو اس قسم کا کام کرتا ہے جس کے لیے نہ تربیت کی ضرورت ہے اور نہ تعلیم کی۔ یعنی یہ بنیادی تنخواہ ہے جو ہر کام کرنے والے کو ملنی چاہیے۔
- اب اس کے اوپر اگر کوئی ایسا کام کرتا ہے جس کے لیے تربیت کی ضرورت ہے تو اس کا حق پھر اس سے بھی زیادہ ہے۔
- پھر اگر کوئی ایسا کام کرتا ہے جس کے لیے تربیت اور تعلیم دونوں کی ضرورت ہے تو

پھر اس کا حق اور بھی زیادہ ہے۔

- پھر اگر کوئی ایسا کام کرتا ہے جس کے لیے نہ صرف تربیت اور تعلیم کی ضرورت ہے بلکہ اچھی تربیت اور تعلیم کی ضرورت ہے اس کا حق اور بھی زیادہ ہے۔
- اور جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں مسجد کے امام صاحبان اور مدرسوں میں تعلیم دینے والے علمائے کرام اور مفتیان عظام نہ صرف ہمارے لیے ایسا کام کرتے ہیں جس کے لیے اچھی تربیت و مشق اور اچھی تعلیم کی ضرورت ہے بلکہ اس میں بھی وہ ہمارے لیے دنیوی کام نہیں کرتے بلکہ دینی کام کرتے ہیں تو پھر ان کا حق تو اور بھی زیادہ ہے۔

تباہی جو چھ ہزار نے مچائی

ہم نے جب اپنی مسجدوں کے اماموں کو اور علما کو ان کے حقوق نہ دیے تو اس سے بہت سے دینی اور دنیوی نقصانات ہوئے اور مسلمانوں کے لیے تقریباً ہر محاذ پر ناکامیوں کا سامنا کرنا ایک عام سی بات ہوگئی۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہ نقصانات اور ناکامیاں بس موجودہ زمانے میں مسلمانوں کی بگڑی ہوئی قسمت کا حصہ ہیں جو خود بخود ہو رہی ہیں اور ان میں ہمارا کوئی رول نہیں ہے۔ یعنی چونکہ مسلمانوں کے دن اچھے نہیں چل رہے ہیں اس لیے ان کو بہت سی ناکامیوں اور نقصانات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ نقصانات اور یہ ناکامیاں ہماری اپنی غلط پالیسیوں، غلط منصوبہ بندیوں اور کبھی جلدی میں اور کبھی غفلت کے ساتھ لیے گیے فیصلوں اور اقدامات کی دین ہیں۔ یہ ہماری قسمت کے بجائے ہماری غفلت کا نتیجہ ہیں۔ ہمارے خود کے کاموں کے پھل ہیں۔ ان میں سے کچھ نقصانات ہم ذیل میں ذکر کرتے ہیں۔

علما اپنے بچوں کو دینی تعلیم سے جدا کرنے لگے

جب مسجدوں کے اماموں اور مدارس کے مدرسین اور علمائے کرام کو ان کے حقوق ادا نہ کیے گئے تو انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم کا میدان بدل دیا۔ پہلے وہ اپنے بچوں کو علم دین حاصل کراتے تھے اور ان کا مدرسوں میں داخلہ کراتے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ہماری تنخواہیں اتنی کم ہیں کہ اس کی بنیاد پر ان کے گھر کے بنیادی خرچ بھی پورے نہیں ہوتے۔ اور وہ اپنی زندگیاں بڑی مصیبتوں اور مشکلوں میں گزارتے ہیں۔ اگر کوئی بیمار ہو جائے تو اس کا معیاری طور پر علاج نہیں کروا سکتے۔ بچوں کو کسی معیاری ادارے میں تعلیم نہیں دلوا سکتے۔ اگر زندگی میں کوئی ناگہانی پریشانی آجائے تو اس کا مقابلہ کرنے کی سکت وہ اپنے اندر نہیں پاتے، تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کی زندگی تو جیسے گزرے گی گزر ہی جائے گی، لیکن انہیں کم سے کم اپنے بچوں کے مستقبل کو محفوظ بنانا ہو گا۔ انہیں اپنے بچوں کو اس حال میں چھوڑ کر نہیں جانا ہو گا کہ وہ بھی ان تمام طرح کی تکلیفوں اور مشکلات کا سامنا کریں جن کا سامنا وہ خود کر رہے ہیں۔

ان تمام باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے انہوں نے یہ مناسب سمجھا کہ وہ اپنے بچوں کا داخلہ مدرسے میں نہ کروا کے اسکول میں کروائیں۔ وہ ان کو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم دلوائیں۔ وہ ان کو دینی تعلیم کے بجائے دنیوی تعلیم دلوائیں۔

مدرسے بند ہونے کی کگار پہ آگئے

حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف ائمہ اور علمائے کرام نے مدرسوں سے دوری اختیار کرنا شروع کر دی بلکہ تمام قسم کے لوگوں نے مدرسوں سے اپنا منہ پھیرنا شروع کر دیا۔ اور نتیجہ یہ

ہوا کہ مدرسے تیزی سے خالی ہونے لگے بلکہ بند ہونے کی کگار پہ آ گئے۔ اور یہ سب اس کے باوجود ہو گیا کہ علمائے کرام طرح طرح سے اپنی قوم کے لوگوں کو اس بات کی ترغیب دلاتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کو مدرسے میں تعلیم دلوائیں۔ وہ ان کو بتاتے ہیں کہ اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم ایک مسلمان کے لیے اتنی ضروری نہیں ہے جتنی مدرسے کی تعلیم اس کے لیے اہمیت رکھتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ طلبہ کو علم دین کی تعلیم صد فیصد مفت میں دلوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ طلبہ کا ایک روپیہ خرچ نہ ہو اور وہ ان کو کتابیں مفت میں دیں، رہائش مفت میں مہیا کریں، لائبریری مفت میں مہیا کریں، ہاسٹل مفت میں دیں، ٹیوشن مفت میں دیں، بلکہ ہر وقت کا کھانا مفت میں دیں۔

لیکن لوگوں کے مدرسوں سے دوری اختیار کرنے کی وجہ کیا ہے؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلم قوم بدنصیب ہو گئی ہے؟ اس کی قسمت نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا ہے؟ یا وجہ کچھ اور ہے؟

ہاں وجہ کچھ اور ہی ہے۔ مجھے آپ بتائیے، سوچ کر بتائیے۔ لوگ مدرسہ کس لیے آئیں؟ وہ اپنے بچوں کو مدرسے میں داخلہ کیوں دلائیں؟ دراصل اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخلہ دلوانے کے بعد والدین کو اپنے بچوں کے حوالے سے ایک امید پیدا ہو جاتی ہے (ہم نہیں کہتے کہ ہر ایک والدین کی امید پوری ہو جاتی ہے) کہ ان اداروں سے پڑھ لکھ کر ان کے بچے کو یا تو کوئی مناسب نوکری مل جائے گی۔ یا کم سے کم دنیا کا اتنا علم اسے ضرور حاصل ہو جائے گا کہ وہ جو بھی بزنس سنبھالے گا یا جو بھی کام سنبھالے گا اس کو کامیابی سے سرانجام دے گا۔ یہی امید، اطمینان اور بھروسہ ہے جو ان کو اس بات کے لیے مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اسکول، کالج یا کسی بھی دنیوی ادارے میں داخلہ دلوائیں۔

دوسری طرف والدین یہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے اپنے بچے کو

مدرسے میں داخلہ دلوایا تو پڑھ لکھنے کے بعد، فارغ ہونے کے بعد وہ کیا کرے گا۔ وہ جانتے ہیں یا تو وہ کسی مسجد کا امام بنے گا یا کسی مدرسے کا مدرس۔ یا پھر ایک خطیب بنے گا یا پھر ایک نعت خواں۔ لیکن نعت خواں بننا بھی کسی کے اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ نعت خواں وہی بن سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے خوبصورت آواز سے نوازا ہے۔ خوبصورت آواز کو حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ وہ خدا کی عطا اور اس کا احسان ہے۔ جسے چاہے دے، جسے چاہے نہ دے۔

وہ جانتے ہیں کہ اگر وہ امام بنے گا تو اس کی تنخواہ چھ ہزار روپے سے زیادہ نہ ہوگی اگرچہ وہ ملک کے سب سے بڑے شہر میں سب سے بڑی مسجد میں ہی امامت کیوں نہ کرے۔ اور اگر وہ کسی مدرسے میں مدرس بنے گا تو بھی اس کی تنخواہ چھ ہزار روپے سے زیادہ نہ ہوگی اگرچہ وہ ملک کے سب سے بڑے شہر کے سب سے بڑے مدرسے میں مدرس کیوں نہ بنے۔ اور اگر وہ خطیب یا نعت خواں بنے گا تو یہ دونوں خدمات کوئی مستقل ملازمت یا جاب نہیں ہیں۔ اور اس لیے یہ دونوں کام اس بات کی گارنٹی نہیں دیتے کہ وہ کسی کے مستقبل کو محفوظ اور مضبوط بنادیں گے۔

وہ ایک خطیب کا خدمت دین کا جذبہ اور دین کی تعلیمات کو لوگوں تک پہنچانے کی اس کی ایک نیک خواہش ہوتی ہے جس کے تحت وہ اس کام کو اپنی ذمہ داری سمجھنے لگتا ہے۔ یا پھر اس کی بے روزگاری ہوتی ہے جو اسے اس میدان میں اتار دیتی ہے۔ اسی طرح نعت خواں اس لیے نعت خواں بن جاتا ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ لوگوں کے درمیان اللہ رب العزت کے ذکر اور اس کے حبیب مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریفوں کے نغمے گونجتے رہیں اور ان کے دل ان مقدس نغموں کے زیر اثر اللہ و رسول عزوجل و صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے سرشار اور سرسبز و شاداب رہیں۔ یا پھر اسے بھی اس کی بے روزگاری اس میدان میں لے آتی ہے۔ بہر حال خطابت ہو یا نعت خوانی یہ کسی مدرسے کے طالب علم کے لیے مستقل

اور پرمانینٹ (Permanent) کیریئر نہیں ہیں۔

دوسری طرف کسی بزنس کو کامیابی سے سنبھالنا اور اسے آگے بڑھانا بھی مدرسے کے ہر طالب علم کے لیے آسان کام نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کے لیے دنیا اور اس سے متعلق چیزوں کا علم ضروری ہے۔ جبکہ ابھی مدرسوں نے دنیوی علوم کو پوری طرح سے اپنے نصاب میں شامل نہیں کیا ہے اگرچہ اس سمت میں کوششیں جاری ہیں۔ اس لیے بزنس کو بھی اس کے لیے ایک کیریئر نہیں مانا جاسکتا۔ اس طرح سے مدرسے کے طالب علم کے کیریئر میں صرف دو چیزیں ہیں یا تو وہ مسجد کا امام بن سکتا ہے یا کسی مدرسے کا مدرس۔ اور دونوں کی تنخواہ ہے چھ ہزار۔ جب والدین ان سب چیزوں کا اندازہ لگاتے ہیں تو وہ اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اگر انھیں اپنے بچے کی زندگی کو محفوظ اور خوش حال بنانا ہے تو انھیں مدرسے کو خیر آباد کہنا ہوگا۔ (11)

ایمانداری، محبت اور عمل کی رخصتی ہونے لگی

دین سماج سے، لوگوں کے بیچ سے اور لوگوں کی زندگیوں سے کم ہوتا جارہا ہے، ختم ہوتا جارہا ہے، اٹھتا جارہا ہے۔ دین داری کم ہوتی جارہی ہے۔ دین سے جڑی ہوئی چیزوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا جانے لگا ہے۔ اخلاق، تہذیب اور اچھی عادتیں غائب ہوتی جارہی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لوگ دین کو سیکھنے اور اس کا علم حاصل کرنے سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ مدرسوں میں داخلہ لینے والوں اور ان میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد دن بدن گھٹتی جارہی ہے۔ مدرسے خالی ہوتے جارہے ہیں۔

(11) یہاں ہمارا مقصد مدرسوں کے نظام کی تنقید کرنا نہیں ہے۔ یہ مدرسے ہی ہیں جنھوں نے اتنے پرفتن دور میں بھی دین متین کی حفاظت کی اور انہیں کی وجہ سے دین ہم تک پہنچا اور آج بھی اسکے اصل محافظ وہی ہیں۔ یہاں بتانا مقصود یہ ہے کہ لوگوں کے خیالات مدارس کے بارے میں کس طرح تبدیل ہوتے جارہے ہیں۔

مدرسے ہی ایسا پلیٹ فارم ہیں جہاں لوگوں کو علم دین کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، مدرسے بند ہونے کی کگار پہ آگئے ہیں۔ تو پھر علم دین لوگوں میں، سماج میں اور لوگوں کی زندگی کے مختلف شعبوں میں جائے کیسے؟ اور جب لوگوں کی زندگیوں میں دین کا علم نہیں پہنچے گا تو وہ دین دار کیسے بنیں گے؟ ان میں اخلاق، تہذیب، ایمانداری، امانت داری، وفا، ہمدردی، نرمی، محبت اور آداب کیسے آئیں گے؟ اور جب معاشرے میں یہ سب باتیں نہیں ہوں گی تو ظاہر ہے نفرت بڑھے گی، دھوکہ دہی بڑھے گی، ظلم بڑھیں گے۔ کدورتیں اور بے ایمانیاں بڑھیں گی۔ لڑائیاں اور بے چینیاں بڑھیں گی۔ اور پھر یا تو دوبارہ سے اٹھ کر، کھڑے ہو کر ہم قوم مسلم خود کو بدلنے کی کوشش کریں گے یا ہم سماج کی اس بدحالی پر زندگی بھر آنسو بہاتے رہیں گے اور کریں گے کچھ بھی نہیں۔

قابل امام اور علما کم ہونے لگے

ہم کسی بھی کام میں دل وجان سے محنت اس وقت کرتے ہیں جب ہمیں امید ہوتی ہے کہ اس کام کا جو پھل ہمیں ملے گا وہ بہت قیمتی ہے۔ اس کام کے نتیجے میں ہماری زندگی کی تنگیاں خوشحالیوں سے بدل جائیں گی۔ ہمارے دن سنور جائیں گے۔ اور اگر ہمارے ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں یہ بات آگئی کہ ہم جو کام کر رہے ہیں اس کا کوئی پھل ہمیں ملنے والا نہیں ہے، یا اس کام سے ہمیں جو نتیجے ملیں گے وہ معمولی سے ہوں گے، یا اس کام سے ہماری زندگی میں کوئی خاص قسم کی تبدیلی نہیں آئے گی، تو پھر چاہ کر بھی اس کام کے لیے محنت نہیں کر پاتے۔ اس کام کو وقت دینا ہمیں اپنے وقت کو ضائع کرنا معلوم ہوتا ہے۔ ہم اس کام میں اپنی پوری توجہ نہیں ڈال پاتے۔

نہ چاہتے ہوئے بھی مدرسے کے طلبہ کے ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں یہ بات

آ ہی جاتی ہے کہ مدرسے سے فراغت کے بعد ان کی زندگی بہت زیادہ بدلنے والی نہیں ہے۔ ان کے گھر کی تنگیاں، مصیبتیں اور مشکلات کہیں جانے والی نہیں ہیں۔ وہ اگرچہ پانچ سو کتابوں کا علم حاصل کیوں نہ کرلیں ان کی امت انہیں چھ ہزار روپے سے زیادہ کچھ دینے والی نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے وہ ان سب باتوں کا کھلم کھلا اقرار نہ کریں۔ لیکن ان سب باتوں کے بارے میں وہ لاشعوری طور پر ہر وقت سوچ رہے ہوتے ہیں۔ ان کا دماغ ان سب چیزوں کے بارے میں غور کررہا ہوتا ہے اگرچہ انہیں خود بھی اس بات کا شعور نہیں ہوتا کہ ان کا دماغ کسی خاص مسئلہ پر غور و فکر کر رہا ہے۔

اس طرح وہ رفتہ رفتہ احساس کمتری کا شکار ہوجاتے ہیں یا ناامیدی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ ان کی ہمتیں جواب دینے لگتی ہیں۔ پڑھائی اور مطالعہ کی طرف سے ان کا من اچاٹ ہونے لگتا ہے۔ چاہ کر بھی وہ کتابوں کو بہت زیادہ دیر تک اپنے سامنے نہیں رکھ پاتے۔ اب ان کو کتابوں کا مطالعہ اور ان کو یاد کرنا ایسے لگنے لگتا ہے جیسے وہ اپنا وقت ضائع کر رہے ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ باصلاحیت اور قابل اماموں اور علما کی کمی ہونے لگی۔ اگرچہ قابل علما اور امام بالکل ختم نہیں ہوگئے یا دنیا سے معدوم نہیں ہوگئے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ایسے علما اور اماموں کی تعداد میں کافی گراوٹ آگئی ہے۔

باصلاحیت اور قابل علما کی تعداد میں کمی آنے کی وجہ ایک اور بھی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب مدرسوں میں طلبہ کی تعداد کم ہونے لگی تو ان کے درمیان مسابقہ اور کمپٹیشن (Competition) کا ماحول ختم ہونے لگا۔ مسابقہ اور کمپٹیشن کا ماحول ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر میں طلبہ کے اندر محنت اور جد و جہد کا جذبہ پیدا کردیتا ہے۔ ان کی صلاحیتوں میں نکھار لاتا ہے۔ ان کے اندر قوت اور ہمت میں اضافہ کرتا ہے۔ اسی وجہ سے جن اداروں میں مسابقہ اور کمپٹیشن کا ماحول ہوتا ہے ان اداروں سے فارغ ہونے والے

طلبہ بہت قابل اور باصلاحیت ہوتے ہیں۔ اور ظاہر ہے جہاں یہ ماحول نہ ہو یا پہلے کبھی تھا اور اب ختم ہو گیا ہو وہاں سے جو طلبہ فارغ ہوں گے ان کے اندر صلاحیت اور قابلیت کا درجہ معمولی ہو گا۔ اور مسابقے اور کمپٹیشن کا ماحول وہیں پیدا ہو سکتا ہے جہاں طلبہ کی تعداد بہت زیادہ ہو، جبکہ مدرسوں میں طلبہ کی تعداد مایوس کن حد تک کم ہو چکی ہے۔

سماج میں دہریت و بے دینی بڑھنے لگی

پچھلی کچھ صدیوں میں مغربی افکار، فلسفوں اور علوم نے دنیا کے اکثر علاقوں اور ملکوں میں غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ دوسری تہذیبوں، مذہبوں اور اقدار کے ماننے والے لوگ مغربی افکار، فلسفوں اور علوم کے سامنے اپنی خود کی تہذیب، مذہب، افکار، اقدار اور علوم کو بے وقعت سمجھنے لگے۔ بلکہ وہ اپنی افکار، اقدار اور مذاہب کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ امت مسلمہ کے کچھ لوگ بھی خود کو مغربی افکار اور اقدار کے ان اثرات سے محفوظ نہ رکھ سکے۔ مسلمانوں کی نوجوان نسلوں میں ایک ایسا طبقہ ابھرنے لگا جو مذہب اسلام کے حوالے سے شک اور تذبذب کا شکار ہو گیا۔ وہ خود ہی اپنے مذہب کی بہت سی آراء اور احکام پر اعتراض کرنے لگا۔ بہت سے ان میں گمراہی کا شکار ہو گئے اور بہت سے مرتد ہو گئے یعنی کچھ دہریت زدہ اور کچھ مکمل طور پر دہریت کا شکار ہو گئے۔

جب کسی بھی مذہب یا عقیدے کے ماننے والے لوگ شکوک و شبہات کا شکار ہونے لگیں تو ان کے اعتراضات اور شکوک و شبہات کا اطمینان بخش جواب دیا جانا ضروری ہے۔ اس کے لیے لازمی ہے کہ ان کو اس طرح کے جوابات ملیں جن کے پیچھے مضبوط دلائل ہوں۔ اور مسلم معاشرے میں لوگوں کے اعتراضات اور شکوک و شبہات کا جواب دینا علما اور مفتیان کرام کا کام ہے۔

جیسا کہ اوپر بتایا گیا، جب ہم نے مسجدوں، دینی اداروں، علما اور اماموں کو مالی طور پر اپاہج بنا دیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف علما کی تعداد تیزی سے کم ہونے لگی بلکہ اس کا ان کی صلاحیت اور قابلیت پر بھی برا اثر پڑا۔ پھر اس کے نتیجے میں امت مسلمہ کے وہ نوجوان جو شکوک و شبہات کا شکار ہو گئے، یا دہریت زدہ، گمراہ یا معاذ اللہ مرتد ہو گئے ان کے لیے اس طرح کے باصلاحیت اسلامی اسکالر اور علما موجود نہ تھے جو ان کے سوالات کے تشفی بخش جوابات دے سکیں یا ان کو مطمئن کر سکیں۔ یا اگر جواب دینے والے اسکالرز اور علما موجود بھی تھے تو ان کی تعداد اتنی کم ہو چکی تھی کہ ان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ اس نوجوان طبقے کی اتنی بڑی تعداد کو ڈیل کر سکیں۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ مسلم معاشرے میں دہریت یا گمراہی بجائے کم ہونے کے اور تیزی سے بڑھنے لگی۔

علما کو حقارت کی نظر سے دیکھا جانے لگا

جب آمدنی ناکافی ہو تو اس کا برا اثر زندگی کے ہر شعبے پر پڑتا ہے۔ اور یہ اتنا واضح ہوتا ہے کہ خود نظر آتا ہے۔ ناکافی آمدنی کے زندگی پر ہونے والے اثرات کو محنت کر کے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ جب آمدنی خستہ حالی کا شکار ہو تو گھر، اس کے در و دیوار، اس کا فرش، گھر کے مختلف حصے، چھت اور باقی تمام چیزیں بھی خستہ حالی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ گھر میں رہنے والے تمام بچوں، والدین اور دیگر افراد کے لباس اس بات کی گواہی دینے لگتے ہیں کہ گھر کے اندر کی دنیا تنگی کی شکار ہو گئی ہے۔

جب کوئی گھر غربت اور تنگ حالی کا شکار ہو تو گھر کے افراد کی زبان اور لہجے میں ہمت اور طاقت کے نشانات نظر نہیں آتے۔ ان کی باتوں، ان کے خیالات، ان کے مزاجوں میں ناامیدی، شکستگی اور احساس کمتری صاف نظر آتے ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے

جیسے انہیں دوسرے لوگوں سے بات کرنے کے لیے کسی کی اجازت درکار ہو۔ وہ ہر وقت گھبرائے ہوئے اور خوفزدہ نظر آتے ہیں۔

اگر تنگ حالی سے گھرے گھروں میں کوئی اچانک بیمار ہو جائے تو گھر والوں کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں، ان کو سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کریں۔ اگر تھوڑے سے پیسے جو ان کے گھر میں رکھے ہوئے ہیں ان کو بچانے کی فکر میں وہ کسی معمولی سے ہاسپٹل میں اپنے مریض کو ایڈمٹ (Admit) کرائیں تو پھر یہ یقین کر کے نہیں بیٹھ سکتے کہ ان کا بیمار ٹھیک ہو جائے گا۔ اور اگر وہ کسی اچھے ہاسپٹل سے علاج کروانا چاہیں تو یہ ان کے لیے ممکن ہی کہاں ہے؟ اس وجہ سے ایسے گھروں میں کئی لوگ لمبی بیماریوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔ ان گھروں کے بچے کسی اعلیٰ قسم کے اداروں میں تعلیم حاصل نہیں کر پاتے۔ اگر کسی طرح وہ کسی اعلیٰ قسم کے تعلیمی ادارے میں داخلہ لینے میں کامیاب بھی ہو جائیں تو ان کے والدین کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے کہ وہ ہر چھ مہینے میں ان کو نصاب کی کتابیں دلوا سکیں۔ پھر انہیں ہر مہینے تعلیمی ادارے کی موٹی فیس بھی ادا کرنا ہوتی ہے۔ اس کا بندوبست کہاں سے ہو گا؟

عموماً کسی بھی گھر والے کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ اس کے رشتہ دار، اس کے دوست واحباب اس کے گھر پر آیا کریں، اس کے یہاں مہمانی کیا کریں، اس کے گھر کی رونق بڑھایا کریں۔ لیکن اگر گھر غربت اور بدحالی کا شکار ہو تو کسی رشتہ دار، دوست یا مہمان کی آمد اسے بے چین اور پریشان کر دیتی ہے۔ وہ خوفزدہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے مہمانوں کی خاطر داری کس طرح کرے گا؟ ان کو کیا کھلائے گا، کیا پلائے گا؟ ان سب کاموں کے لیے پیسہ کہاں سے آئے گا؟

اس طرح کے گھر نہ صرف اندر سے ٹوٹ جاتے ہیں بلکہ ان کا ظاہر بھی ان کی چھپی ہوئی مشکلوں اور پریشانیوں کی گواہی دینے لگتا ہے۔ ان کے ظاہری حالات ان کے

اندورنی حالات کا ترجمہ کر کے لوگوں کو پڑھ کر سنا رہے ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ لوگ اپنے گھر کے اندر کی دنیا میں تو ویران اور شکست خوردہ ہوتے ہی ہیں، ان کی یہ ظاہر کی شکستہ حالی ان کو دوہری مار مارتی ہے۔

وہ اس طرح کہ جب سماج اور معاشرے کے لوگ ان کو اس طرح کے حالات میں دیکھتے ہیں تو ان کی نظر اس طرف تو نہیں جا پاتی کہ انہیں اس حال میں پہنچایا کس نے ہے؟ ان کی اس بدحالی اور جھلسی ہوئی زندگی کے پیچھے ذمہ دار کون ہے؟ ان کی نظر تو صرف اس بات کی طرف جاتی ہے کہ یہ پرانے خیالات کے، میلے کچیلے کپڑوں میں رہنے والے، ٹوٹے پھوٹے گھروں میں رہنے والے سماج کے بے وقعت لوگ ہیں۔ جب تک ان کا یہ راز ظاہر نہ ہوا تھا تب تک وہ خواہ کتنے بھی برے تھے اپنے گھر کے تھے، اپنے گھر میں تھے۔

لیکن اب جب ان کی غربت اور شکستہ حالی سماج کی نظر میں آگئی تو سماج انہیں حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ جہاں موقع ملے انہیں ذلیل کیا جاتا ہے۔ ان پر طنز بھرے جملے کسے جاتے ہیں۔ ان کی زندگیوں پر کہانیاں بنائی جاتی ہیں۔ ان کو سماج میں سنا اور سنایا جاتا ہے۔ ان کو فلمایا جاتا ہے۔ ان کو لکھا اور چھاپا اور نشر کیا جاتا ہے۔ ان کی غلطیوں اور ان کی خامیوں کو لوگوں کے سامنے ایسے پیش کیا جاتا ہے جیسے کسی عظیم مہم کو سر کیا جارہا ہو۔ ہمارے سماج اور معاشرے کی تمام قسم کی برائیوں کا ذمے دار انہیں کو قرار دیا جاتا ہے۔

جب ہم عوام اور مقتدیوں نے مسجدوں کے اماموں، علمائے کرام اور مفتیان عظام کو ان کے حقوق ذمے داری اور ایمانداری سے ادا نہ کیے، تو پہلے تو وہ مالی طور پر خستہ حالی اور غربت کا شکار بنے اور پھر سماج اور معاشرے کی نظر میں وہ ایک حقیر اور بے وقعت سی قوم بن کر رہ گئے۔ اور پھر ان کے ساتھ وہ سب کچھ ہونے لگا جو اس انسان کے ساتھ

ہوتا ہے جسے معاشرہ بے وقعت اور بے قدر سمجھتا ہے۔ معاشرے کی ہر برائی کا ذمے دار بھی سماج اسی کو قرار دیتا ہے جسے وہ بے وقعت اور بے قدر سمجھتا ہے۔

اماموں اور علما کے ساتھ بھی بالآخر یہی ہوا۔ پھر سماج اور سماج کے لوگ جو ہم خود ہیں اس طرح بولنے لگے: اگر ہمارے معاشرے میں غربت ہے تو اس کے ذمے دار "مولوی" ہیں۔ جہالت ہے تو اس کے ذمے دار مولوی ہیں۔ اگر بے اعمالیاں اور بدکاریاں پھیل رہی ہیں تو اس کے ذمے دار مولوی ہیں۔ اگر بدعنوانیاں اور بے ایمانیاں ہیں تو اس کے ذمے دار مولوی ہیں۔ اگر مسلمان سیاسی زوال کے شکار ہیں تو اس کے ذمے دار مولوی ہیں۔ اگر امت مسلمہ معاشی بدحالی کا شکار ہے تو اس کے ذمے دار مولوی ہیں۔ اگر سماج سے اقدار نکل گئ ہیں تو اس کے ذمے دار مولوی ہیں۔ اگر گھروں کے اندر سے اخلاقیات رخصت ہوگئی ہیں تو اس کے ذمے دار مولوی ہیں۔ غرض ہمارے سماج میں ہر قسم کی برائی کے ذمے دار مولوی ہیں، علما ہیں۔

دراصل جب کوئی کسی حادثے کا شکار ہوکر یا کسی اور وجہ سے کمزور ہوجاتا ہے یا زوال کے نرغے میں آجاتا ہے تو اس کے ارد گرد کے لوگ اپنی خود کی غلطیوں اور پریشانیوں کا ذمے دار بھی اسی کو قرار دینے لگتے ہیں۔ پھر اس کمزوری اور زوال کے شکار فرد، جماعت یا قوم نے خود سے جو غلطیاں کی ہوتی ہیں ان کے لیے تو وہ ذمے دار ہوتے ہی ہیں۔ دوسرے لوگ، جماعتیں یا قومیں اپنی خود کی غلطیوں، خامیوں، پریشانیوں اور تکلیفوں کا ذمے دار بھی انہیں کو ماننے اور قرار دینے لگتی ہیں۔

ہم جب مختلف ملکوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے ممالک ایسے ہیں جہاں اقلیتوں کے ساتھ اکثریتی طبقے کا سلوک اچھا نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی ملک میں ہر برائی کی جڑ اقلیتی طبقے کو ہی قرار دیا جاتا ہے۔ یہ اس لیے کہ تعداد میں کمی کی

وجہ سے اقلیتی طبقے کے لوگ اکثریتی طبقے کے مقابلے میں کمزور ہوتے ہیں۔ اگر ملک کے کسی علاقے میں کوئی مجرمانہ واردات ہوجائے تو مجرموں کو سب سے پہلے اقلیتی طبقے کے اندر ہی تلاش کیا جاتا ہے۔ اگر ملک زوال اور پسماندگی کا شکار ہے تو اس کا ذمے دار بھی اقلیتی طبقے کے لوگوں کو ہی قرار دیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقلیتی طبقے کے خلاف ظلم و بربریت کے کھیل کھیلے جاتے ہیں لیکن ظالم پھر بھی اقلیتی طبقے کو ہی قرار دیا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں اکثریتی طبقے کے کچھ لوگوں کا یہی ماننا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں جو کچھ بھی غلط ہوا وہ مسلمانوں کی وجہ سے ہوا۔ بلکہ آج بھی ہندوستان کے ایک بڑی طاقت بن کر نہ ابھر پانے کی وجہ مسلمان ہی ہیں۔ اگر یہ ممکن ہوجائے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کسی طرح ہندوستان سے باہر نکال دیا جائے تو پھر اس ملک کی ساری برائیاں کچھ لمحات میں ختم ہوجائیں گی۔

اسی روشنی میں ہم اس بات کی حقیقت بھی جاننے کی کوشش کرسکتے ہیں کہ کیا ائمۂ کرام اور علمائے عظام واقعی سماج کی تمام قسم کی برائیوں کے لیے ذمے دار ہیں یا پھر انہیں آسانی کے ساتھ نشانہ اس وجہ سے بنایا جانے لگا کہ وہ کمزور لوگ ہیں؟ اور کیا وہ کمزور خود سے ہیں یا ہم مقتدیوں اور عوام نے ان کو ان کے حقوق پوری دیانت داری کے ساتھ ادا نہ کرکے ان کو تنگ حالی کی زندگی جینے پر مجبور کردیا اور پھر اس طرح انہیں آسانی سے برائیوں اور تنقیدوں کا نشانہ بنایا جانے لگا؟

مفتیان کرام تک امامت کرنے پر مجبور ہوگئے

ایک لمبا عرصہ لگتا ہے اس مقام پر پہنچنے کے لیے جب ہم کسی فرد کو ''مفتی'' کا لقب دیتے ہیں۔ نہ صرف لمبا عرصہ لگتا ہے بلکہ انتہائی درجے کی محنت، جدو جہد اور

جانفشانی درکار ہوتی ہے۔ راتوں کو دن بنانا پڑتا ہے۔ ہزاروں طلبہ علم دین کی راہ میں سفر طے کر رہے ہوتے ہیں لیکن ان میں گنے چنے ہی ہوتے ہیں جو اس بلند مقام تک پہنچ پاتے ہیں۔ مدرسوں کے موجودہ تعلیمی نظام کے مطابق جب مولویت کے کورس کی پہلی جماعت میں بچہ کو داخلہ دلایا جاتا ہے تو اس کو بہترین اردو داں، اردو کا بہترین املا لکھنے والا اور بہترین عربی خواں ہونا ضروری ہے۔ اگر کسی طالب علم کا ہاتھ ان تینوں چیزوں میں سے کسی میں کمزور ہو تو پھر اس کو مولویت کے کورس میں داخلہ نہیں ملتا۔

مولویت پانچ سال کا لمبا کورس ہوتا ہے۔ جب ایک طالب علم مولویت کے کورس میں داخلہ لیتا ہے تو عموماً اس کی عمر چودہ پندرہ سال ہوتی ہے۔ جب مولویت کا کورس مکمل ہوجاتا ہے پھر اس کے بعد جب طالب علم مزید دو سال اور تعلیم میں خرچ کرتا ہے تو ہم اسے عالم کا لقب دیتے ہیں اور اسے عالمیت کی ڈگری ملتی ہے۔ یہ ڈگری کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دی جانی والی ڈگریوں میں گریجویشن (Graduation) کے برابر ہوتی ہے۔ پھر اس کے بعد جب طالب علم مزید دو سال اور خرچ کرتا ہے تو ہم اسے فاضل کا لقب دیتے ہیں اور اسے فضیلت کی ڈگری دی جاتی ہے۔ یہ ڈگری کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دی جانے والی پوسٹ گریجویشن (Post-graduation) کے برابر ہوتی ہے۔ اس کے بعد جب وہ طالب علم دو سال اور خرچ کرتا ہے تب کہیں جاکر وہ اس قابل ہوتا ہے کہ ہم اسے مفتی کا لقب دیتے ہیں۔ دراصل یہ لقب ہم اسے نہیں دیتے وہ اپنی محنت سے حاصل کرتا ہے۔ یہ اس کی دن ورات کی جانفشانی کا پھل اور نتیجہ ہوتا ہے۔ مفتی کی ڈگری کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دی جانے والی ڈاکٹریٹ یا پی ایچ ڈی (PhD) کے برابر ہوتی ہے۔ اس طرح یہ مکمل گیارہ سال ہوگئے۔

پھر اگر ایک مفتی حافظ قرآن بھی ہے تو اس کے لیے تین سال کا اضافہ اور کرلیں۔

اس طرح ایک مفتی دین حافظ قرآن بھی ہے تو وہ ایک طرح سے چودہ سال کا لمبا عرصہ دینی تعلیم کو حاصل کرنے میں خرچ کرتا ہے۔ پھر اگر ساتھ میں وہ قاری بھی ہے تو دو سال کا ہم اور اضافہ کر سکتے ہیں۔ اب کل ملا کر سولہ سال ہو گئے۔ [۱۲]

اس طرح اگر ایک طالب علم ان تمام کورسوں اور ڈگریوں کو حاصل کرنے کی ٹھان لیتا ہے اور وہ ان تمام کورسوں اور ڈگریوں کو اپنی منزل اور اپنا خواب بنالیتا ہے اور وہ ان کو حاصل کر بھی لیتا ہے تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اپنی فراغت کے وقت تک وہ اپنی تعلیم کے لیے اپنی زندگی کے کتنے ہی قیمتی برس خرچ کر چکا ہوتا ہے۔

پھر ایک بات اور بھی ہے۔ ایک طرف اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم ہے اور دوسری طرف مدرسوں کی تعلیم ہے۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم کے مقابلے میں مدرسوں کی تعلیم، وہاں کا نصاب، درس کی کتابیں اور ان کتابوں میں پڑھائے جانے والے مضامین اور نظریات و مشمولات اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے مقابلے کافی زیادہ مشکل اور محنت طلب ہوتے ہیں اور ان کا معیار کافی زیادہ اونچا ہوتا ہے۔

پھر یونیورسٹیوں میں کم سے کم اس بات کی آزادی ہوتی ہے کہ ایک طالب علم جس زبان میں چاہے اپنے کورس کی کتابیں پڑھ سکتا ہے۔ اور ساتھ ہی جن کتابوں سے چاہے پڑھ سکتا ہے۔ ہاں اسے ایک پہلے سے طے شدہ نصاب کو مکمل کرنا ہے۔ لیکن مدرسے کے

---

(۱۲) علم تجوید و قراءت کی تعلیم کے لیے موجودہ دور میں دو طریقے رائج ہیں۔ ایک یہ کہ حفاظ کرام حفظ کی تکمیل کے بعد الگ سے دو سال خرچ کر کے علم تجوید و قراءت کی سند حاصل کرتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ علم تجوید و قراءت کے کورس کو مولویت کے کورس میں ہی شامل کر دیا جاتا ہے اور اسے مولویت کے پہلے دو سالوں میں پورا کروا دیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جس طالب علم نے حفظ کے بعد علم تجوید و قراءت کے کورس کی تعلیم الگ سے لی ہو یعنی یہ اس کی مولویت کے کورس کا حصہ نہ ہو تو اس کو ایک مفتی بننے کے لیے کم از کم تقریباً سولہ سال لگیں گے۔ ہاں اگر اس نے مولویت کے کورس کے دوران علم قراءت کی تحصیل کی تو دو سال بچ جائیں گے۔

طالب علم کے لیے ایک اسٹیج کے بعد عربی زبان کو بطور میڈیم (Medium) متعیّن کردیا جاتا ہے۔ ایک تو اس کو اپنی کتابیں عربی زبان میں ہی پڑھنا ہوتی ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ وہی کتابیں پڑھنا ہوتی ہیں جن کتابوں کو مدرسے کی طرف سے متعین کردیا گیا ہوتا ہے۔ ان کی جگہ پہ طالب علم دوسری کتابوں کو نہیں رکھ سکتا، ہاں دوسری کتابوں اور دوسری زبانوں سے مدد لے سکتا ہے۔ تو یہ ہے علمائے کرام اور مفتیان عظام کے علم، ان کی تعلیم اور ان کے زمانۂ طالب علمی کا بیک گراؤنڈ اور اس کی حقیقت۔

لیکن ہم نے مفتیان کرام کے ساتھ کیا کیا؟ ہم نے انہیں اس حد تک نیچے گرادیا کہ وہ خود بھی بھول گئے کہ وہ مفتی جیسے بلند عہدے پر فائز ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ مدرسے کے بہت سے ہونہار اور باصلاحیت طلبہ جنہوں نے بڑی محنت ومشقت کے بعد مفتی کی ڈگری حاصل کی اور اپنے تعلیم حاصل کرنے کے زمانے میں انہیں ہمیشہ ایسا لگتا رہا کہ بس کچھ وقت کی بات ہے، پھر جیسے ہی ان کی ڈگری پوری ہوگی اور فارغ ہونے کے بعد جیسے ہی وہ واپس اپنے گھر، اپنے شہر میں جائیں گے وہ لوگوں کی آنکھ کا تارا بن جائیں گے، لوگ ان کے راستے میں پھول بچھائیں گے، انہیں اپنی پلکوں پہ بٹھائیں گے۔

لیکن جیسے ہی وہ فارغ ہوئے اور واپس گھر پہنچے اور وہ زمینی حقیقت سے خبردار ہوئے تو انہوں نے محسوس کیا کہ دنیا ان کے لیے آج بھی ویسی ہی ہے جیسی وہ ان کے لیے اس دن تھی جس دن وہ پہلی مرتبہ سالوں پہلے اپنے گھر سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے نکلے تھے۔ لوگ ان کو آج بھی ویسے ہی دیکھتے ہیں جیسے اس وقت دیکھتے تھے۔ ان کی کوئی قیمت تب بھی نہیں تھی جب انہوں نے برسوں پہلے علم دین کے حصول کی خاطر اپنا گھر چھوڑا تھا اور ان کی کوئی قیمت آج بھی نہیں ہے جب وہ واپس آئے ہیں۔

اپنے آپ کو کسی طرح صبر دلانے کے بعد جب وہ ملازمت کی تلاش میں لگتے ہیں

اور اس کے لیے وہ کبھی اپنے اساتذہ سے، کبھی اپنے ہم سبق ساتھیوں سے اور کبھی کچھ دوسرے لوگوں سے فون پر یا کسی اور طرح سے رابطے کرتے ہیں تو ان کو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مدرسہ ایسا ہے ہی نہیں جو ان کو اپنے یہاں مدرس رکھنے کے لیے تیار ہو۔ یہ مدرسے ان کو اپنے یہاں مدرس رکھنے سے انکار اس وجہ سے نہیں کرتے کہ انہیں ان مفتیٔ دین کی صلاحیت اور قابلیت میں کسی طرح کا شک ہے بلکہ صرف اس وجہ سے کہ ان کو ضرورت نہیں ہے۔

اور ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ ان مدرسوں میں طلبہ کی جو تعداد ہے وہ بہت کم ہے اور ان طلبہ کے لیے جتنے مدرسین کی ان کو ضرورت ہے اتنے ان کے پاس پہلے سے ہیں۔ اور جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، طلبہ کی تعداد اس وجہ سے کم ہے کیونکہ والدین نے اسی خوف سے کہ اگر انہوں نے اپنے بچوں کو مدرسے میں پڑھایا تو ان کا مستقبل خراب ہو سکتا ہے، اپنے بچوں کو مدرسوں میں تعلیم دلانا بند کر دیا۔ اس طرح پہلے تو ان مفتیٔ دین کو بہت دنوں تک کوئی مدرسہ لینے کو تیار نہ ہوا۔ اور پھر جب کچھ دنوں بعد ان کو کچھ مدرسے ایسے ملے بھی جن کو مدرسین کی ضرورت تھی تو ان میں کوئی مدرسہ ان کو چھ ہزار روپے ماہانہ سے زیادہ دینے کو تیار نہ تھا۔ لیکن انہوں نے غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ چھ ہزار روپے پھر بھی گھر میں خالی بیٹھنے سے تو بہتر ہیں۔ انہوں نے اسی تنخواہ کو قبول کر لیا اور مدرسے کے لیے رخصت ہو گئے۔

لیکن مدرسے میں جب استاذ بن کر پڑھانا شروع کیا تو اندازہ ہوا کہ ان کی وہ زندگی جب وہ مدرسے میں اپنی زندگی طالب علم کی حیثیت سے گزار رہے تھے ان کی اس زندگی سے جس میں وہ استاذ ہیں کئی گنا زیادہ بہتر تھی۔ پہلے جب وہ طالب علم تھے تو آزادانہ زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن اب ان کے پاؤں میں بہت سی زنجیریں اور بیڑیاں ڈال دی گئی ہیں۔

اب ان کی مرضی ان کی مرضی نہیں بلکہ دوسروں کی مرضی ہوتی ہے۔ شاید وہ اب کسی قید خانے میں ہیں۔

انھوں نے جب مدرسے میں بطور استاذ اپنی زندگی کے بارے میں سوچا تو معلوم ہوا کہ میں دن بھر میں کم سے کم سات یا آٹھ گھنٹیاں (Periods) پڑھاتا ہوں۔ جبکہ ایک پروفیسر زیادہ سے زیادہ تین گھنٹیاں پڑھاتا ہے۔ گھنٹیاں پڑھانے کے بعد ظہر سے لیکر عصر تک مجھے تمام طلبہ پر نظر رکھنی ہوتی ہے کہ وہ اپنے اپنے کمروں میں اپنے اپنے سبق یاد کر رہے ہیں یا نہیں۔ پھر اس کے بعد مغرب بعد سے لے کر رات کے بارہ بجے تک انھیں دوبارہ تمام طلبہ پر نظر رکھنی ہوتی ہے کہ وہ مطالعہ کر رہے ہیں یا نہیں۔ اس دوران انہیں دوسرے دن جو سات گھنٹیاں پڑھانی ہوتی ہیں ان کی تیاری بھی کرنا ہوتی ہے۔ اور اگلے دن جن سات کتابوں کے اسباق وہ اپنے طلبہ کو پڑھائیں گے ان میں سے ہر کتاب کا انھیں الگ الگ ایک ایک کر کے مطالعہ کرنا بھی ہوتا ہے۔ درست بات یہ ہے کہ یہ اتنا زیادہ کام ہوتا ہے کہ ان کو خود اپنے ذاتی کاموں کے لیے بھی وقت نہیں مل پاتا۔

یہی نہیں بلکہ ان کو مدرسے کے طلبہ کے لیے کھانے، قیام اور کتابوں کے انتظامات بھی خود ہی دیکھنا ہیں۔ مدرسے کی موجودہ عمارت کی دیکھ ریکھ اور اس کی مزید توسیع کی فکر بھی انہیں کو کرنا ہے۔ مدرسے کی چہار دیواری کے اندر جتنی بھی جگہیں، کمرے، دالان اور جو کچھ بھی ہے ان کی صفائی کا خیال بھی انہیں کو رکھنا ہے۔ اور ان سب چیزوں اور کاموں کے لیے جتنے پیسے کی ضرورت ہوگی اس کے انتظامات بھی انہیں کو کرنا ہیں اور اس کے لیے جلد ہی کچھ رسیدیں چھپوا کر ان کو دے دی جائیں گی۔ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ میری تنہا ذات پر اتنے سارے بوجھ ڈال دیے گئے ہیں جس کے لیے مجھے صرف چھ ہزار روپے دیے جائیں گے تو وہ اپنے لیے اس بات کو مناسب سمجھنے لگے کہ وہ مدرسہ چھوڑ کر کسی مسجد میں

امامت کے فرائض انجام دیں۔

ہم ایسے بہت سے قابل اور باصلاحیت علما، فضلا اور مفتیان کرام سے واقف ہیں جنہوں نے کچھ دن تک مدرسے میں تعلیم دینے اور استاذ رہنے کے بعد بالآخر مسجد کو اپنا ٹھکانہ بنالیا۔ جب کہ ایسا نہیں تھا کہ جو ذمہ داریاں ان کو مسجد میں دی گئیں وہ کسی طرح ان ذمہ داریوں سے کم تھیں جو ان کو مدرسے میں دی گئیں تھیں۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ مسجد میں ان کو نماز بھی پڑھانا ہے۔ اذان بھی دینا ہے جو الگ سے ایک مؤذن کا کام ہے۔ مسجد اور اس کے گوشے گوشے، وضو خانے، باتھ روم کی صفائی ستھرائی اور مسجد کے لیے پانی اور ٹنکی کے انتظامات کی دیکھ ریکھ بھی رکھنا ہے جو حقیقت میں ایک مستقل اور الگ ملازم کا کام ہے۔

پھر اگر مسجد کے ساتھ میں مدرسہ بھی ہے یا نہیں بھی ہے تو مسجد کے محلے کے تمام بچوں کو تعلیم بھی دینا ہے جو الگ سے ایک مدرس کا کام ہے۔ مسجد اور مدرسے کے لیے فنڈ اکٹھا کرنا بھی انہیں کا کام ہے جو پھر سے ایک الگ ملازم کا کام ہے۔ اور مسجد اور مدرسے کے فنڈ کا تمام حساب وکتاب رکھنا بھی انہیں کا کام ہے جو الگ سے ایک اکاؤنٹنٹ (Accountant) کا کام ہے۔

اس طرح اگر ایک عالم دین یا مفتیِ دین مدرسے میں تدریس کے کام کو چھوڑ کر مسجد میں رہ کر امامت کے فرائض انجام دینے کو ترجیح دیتا ہے تب بھی اسے تقریباً اتنی ہی ذمے داریاں سنبھالنا ہوتی ہیں جتنی وہ اس وقت سنبھالتا تھا جب وہ مدرسے میں تھا اور ایک مدرس ہوا کرتا تھا۔ اور مسجد میں بھی اتنے سارے کام اسے چھ ہزار روپے کے بدلے میں ہی کرنا ہوتے ہیں۔

اگر مسجد میں بھی بطور امام اتنی ہی ذمہ داریوں کو سنبھالنا ہے تو پھر یہ علما، فضلا اور مفتیان کرام مدرسہ چھوڑ کر مسجد میں کیوں آگئے؟ یہ ایک سوال کوئی کرسکتا ہے۔ اور یہ جائز

سوال ہے۔ وہ مدرسہ چھوڑ کر مسجد میں اس لیے آئے کہ یہاں ان کو کچھ ملا یا نہ ملا ایک ذہنی فرصت ضرور مل گئی۔ وہ جب مدرسے میں تھے تو ان کو ہر دن سات گھنٹیاں پڑھانا ہوتی تھیں۔ جس کا آسان سا مطلب یہ ہے کہ انہیں سات الگ الگ کتابیں پڑھانا ہوتی تھیں۔ اور ہر کتاب کو کم از کم پینتالیس منٹ تک پڑھانا ہوتا تھا۔ اور اس کی خاطر انہیں ہر رات اگلے دن کے لیے ہر کتاب کا الگ الگ مطالعہ اور تیاری کرنا ہوتی تھی۔ آسان نہیں ہوتا ہے صبح بیدار ہونے سے لے کر رات میں بستر پر جانے تک لگاتار کتابوں کی دنیا میں رہنا اور باریک علمی باتوں کو دوسروں کو سمجھانا یا خود سمجھنے کی کوشش کرنا۔ اور صبح سے لے کر شام تک لگاتار اتنی محنت کرنے کے باوجود بھی رات میں فقط پانچ سے چھ گھنٹے بلکہ اس سے بھی کم وقت میں اپنی نیند کو پورا کر لینا۔

مدرسہ چھوڑ کر جب وہ مسجد میں آ گئے تو اب ان کو دن بھر گھنٹیاں پڑھانا اور پھر رات بھر گھنٹیاں پڑھانے کی تیاری کرنا اور پھر باقی اوقات میں اس بات کی نگہبانی کرنا کہ طلبہ پوری جانفشانی سے اپنی کتب کا مطالعہ اور پڑھائی کر رہے ہیں یا نہیں، یہ اور اس طرح کے دیگر علمی و ذہنی کاموں سے نجات مل گئی۔ یعنی مسجد میں آکر انہیں ایک طرح سے ایک ذہنی فرصت نصیب ہو جاتی ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسجد میں آکر وہ اس ذہنی مشقت سے تو بچ جاتے ہیں لیکن کچھ ہی دنوں میں کچھ اور دوسری مشقتیں اور پریشانیاں ان کی زندگی میں آجاتی ہیں جن کو بعد میں وہ خود محسوس کرنے لگتے ہیں۔ وہ ذہنی فرصت جو ان کو مسجد میں آکر نصیب ہوئی تھی وہ دوبارہ سے چھن جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ان کا ایک دوسرا نقصان اور بھی ہوتا ہے۔ اور حقیقت میں یہ نقصان ان کا نہیں بلکہ پوری ملت اسلامیہ کا ہوتا ہے، خود ہم لوگوں کا ہوتا ہے، عوام کا ہوتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ ہمیں اس نقصان کا شعور نہیں ہے اور برسوں

تک آگے بھی ہمارے اندر اس کا شعور پیدا ہو جانے کے امکانات نظر نہیں آتے۔

اور وہ نقصان یہ ہے کہ مدرسے میں تدریس کا کام چھوڑ دینے کی وجہ سے علمی دنیا سے دوری ہو جاتی ہے اور کتابوں سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اور جب ان کا تعلق کتابوں کی دنیا سے ٹوٹ جاتا ہے اور مطالعہ سے دوری ہو جاتی ہے تو وقت کے ساتھ ساتھ ان کا علم کمزور ہوتا چلا جاتا ہے۔ قابلیت کی گہرائی کم ہونے لگتی ہے اور صلاحیت ناتوانی کا شکار ہونے لگتی ہے، اور یہ یقیناً ان کا نہیں بلکہ پوری ملت کا خسارہ ہے۔ کیونکہ علما اور مفتیان کرام کا علم پوری ملت کا سرمایہ ہے اور وہ ضائع ہونے لگتا ہے۔ لیکن چونکہ ہماری آنکھیں برسوں سے بند ہیں اور ہم نے خود جان بوجھ کر ان پر پٹی باندھی ہوئی ہے اس لیے یہ خسارہ ہمیں نظر نہیں آتا۔

لیکن ملت کے اس خسارے اور قابل و باصلاحیت علما، فضلا اور مفتیان کرام کا اس بدحالی کا شکار ہونے کے پیچھے ذمہ دار کیا وہ خود ہیں؟ نہیں۔ یہ ہم لوگ ہیں جنہوں نے ان کو اتنا مجبور کر دیا کہ وہ خود بھی اپنا مقام و مرتبہ بھول گئے۔ انہیں قوم مسلم کے لیے بڑے بڑے کارنامے انجام دینے تھے لیکن ہم نے انہیں اس مقام پہ لا کر کھڑا کر دیا کہ وہ اپنا اور اپنے گھر والوں کا پیٹ بھرنے تک کی قوت نہیں رکھتے۔ ہم ان کے حقوق کو بھلا کر اس طرح غفلت کا شکار ہو کر بیٹھ گئے کہ وہ علم جس کو انہوں نے ایک لمبے زمانے تک محنت کرنے کے بعد حاصل کیا تھا وہ اس کو کمزور کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ وہ اپنی دولت کو خود لٹانے کے لیے تیار ہو گئے۔ یہ سارا کارنامہ ہمارے اس چھ ہزار روپے کا ہے جو ہم ان کو دے کر ان کے اوپر بہت بڑا احسان کرتے ہیں۔ کیسے معاف کرے گا ہمارا خدا ہمیں؟

اماموں اور علمانے دنیوی کاروبار شروع کر دیے

جب اماموں اور علما کو ان کے حقوق نہیں دیے گئے، انہیں ان کی اجرت اور تنخواہ کے معاملے میں ایک مزدور کی بھی حیثیت نہیں دی گئی اور کام ان سے کئی کئی مزدوروں کے لیے گئے تو پہلے تو وہ ان سب چیزوں کو نظر انداز کرتے رہے لیکن پھر وقت گذرنے کے ساتھ انہوں نے محسوس کرلیا کہ مسجد میں امامت کرتے ہوئے یا مدرسے میں استاذ بن کر تعلیم دیتے ہوئے ان کی زندگی ہمیشہ تنگ حالی اور غربت کا شکار رہے گی۔ ان کی پریشانیاں کبھی کم نہیں ہوں گی۔ بلکہ ان کی مشکلیں اور دقتیں دن بدن بڑھتی ہی چلی جائیں گی۔ ان کی زندگی کے بغیچے میں کبھی ہریالی آنے والی نہیں ہے، تو انہوں نے بالآخر مسجد اور مدرسے کو خیر آباد کہنے کا فیصلہ کرلیا۔

جو علما امامت کر رہے تھے انہوں نے ہمیشہ کے لیے مسجد سے استعفاء دے دیا اور جو بطور مدرس کسی مدرسے میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے انہوں نے مدرسے سے ہمیشہ کے لیے استعفاء دے دیا۔ یہ ان کی مجبوری تھی جس نے ان سے ایسا کروایا۔ وہ دینی خدمات سے خود کو جدا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن انہوں نے محسوس کرلیا تھا کہ دین سے جڑے رہنے کے لیے بھی پہلے دنیا میں زندہ ہونا اور زندہ رہنا ضروری ہے، جس کے لیے دنیوی زندگی کی روزمرہ کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنا ہوگا، جس کے لیے مالی اور معاشی طور پر بہت زیادہ خوشحال بھی نہیں تو کم از کم خود کفیل ہونے کی ضرورت ہے۔ بالفاظ دیگر کم سے کم اتنے پیسوں کی ضرورت ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کے محتاج نہ رہیں اور مسجد یا مدرسے میں رہتے ہوئے وہ خود کفیل کبھی نہیں بن سکتے۔

اس طرح انھوں نے مسجد یا مدرسے کو خیر آباد کہا، گھر واپس آئے۔ دنیا والوں سے

دنیا کے حالات کے بارے میں پوچھا، ان کے بارے میں جانا، ان کو سمجھا۔ پھر پوری طرح دنیا میں اتر گئے۔ کچھ نے تجارت کرلی۔ اگرچہ انہوں نے کوئی بڑی تجارت نہ کی۔ اور بڑی تجارت کی وہ قوت بھی نہیں رکھتے تھے کیونکہ اس کے لیے موٹی رقم کی ضرورت تھی۔ اور ان کے پاس موٹی رقم تو کیا کبھی چھوٹی رقم بھی جمع نہیں ہو پائی تھی۔ ان کو زیرو (Zero) سے ہی شروعات کرنا تھی۔

تو کسی نے گھر ہی کرانا کی دوکان رکھ لی۔ کچھ نے پھل، سبزی یا کسی اور چیز کا ٹھیلہ لگانا شروع کردیا۔ یا کہیں سے قرضے کا انتظام ہوگیا تو تھوڑا سا بڑا کام کرلیا۔ مثلاً کپڑے بیچنے لگے یا فوٹ ویئرز (Footwears) کی دوکان رکھ لی۔ یا کرائے کی کسی دوکان میں برتن بیچنے لگے۔ یا اسٹیشنری (Stationary) کی دوکان رکھ لی۔ یا مرغی فارم کھول لیا، یا چھوٹا سا اسکول شروع کردیا۔ کسی نے اپنی حیثیت کے مطابق میڈیکل یا یونانی دواخانہ کھول لیا۔ کچھ ایسے تھے جنہوں نے کبھی بچپن میں سلائی کا کام سیکھ لیا تھا، وہ اب انہیں کام آگیا اور انہوں نے سلائی شروع کردی۔ کچھ نے جانور پالنا شروع کردیا اور دودھ کے کام پر گزارا کرنے لگے۔ کچھ نے یہ دیکھتے ہوئے کہ ان کو اردو اور فارسی آتی ہے حکمت سیکھنا شروع کردی۔ کچھ نے بائیک اور کاروں کی مرمت کا کام سیکھنا شروع کردیا۔ کچھ مزدوری کرنے لگے۔

کچھ دوسرے شہر چلے گئے جہاں انہیں کوئی پہچان نہ سکے۔ اور اپنے علاقے سے کہیں دور جاکر ملازمت شروع کردی۔ اور جیسی اور جس قسم کی بھی ملازمت ان کو ملی انہوں نے اس کو کرنے میں کوئی چوں چرا نہ کی۔ ان میں سے کچھ کے پاس برائے نام کھیت کی زمین تھی جو ہر سال کسی دوسرے کو دے دیتے تھے تاکہ وہ اس میں کام کرے اور جو کچھ پیدا ہو اس کا کچھ حصہ اپنے پاس رکھے اور کچھ ان کو دے دے۔ یہ وہ اس لیے کرتے تاکہ وہ ساتھ ہی اپنی امامت یا تدریس کے کام کو بھی جاری رکھ سکیں۔ اس طرح کچھ آمدنی کھیت سے اور

کچھ امامت یا تدریس سے ہو جاتی۔ لیکن ان دونوں سے بھی ان کی بنیادی ضرورتیں بھی مشکل ہی سے پوری ہو پاتیں۔ اب امامت یا تدریس کو ترک کر کے وہ خود ہی اپنے کھیت کے کام میں لگ گئے اور اپنا سارا وقت کھیتی کے کام کو دینا شروع کر دیا۔ کچھ واپس آکر اسی پیشے میں لگ گئے جو ان کے گھر آبائی طور پر کئی نسلوں سے چلا آرہا تھا۔ کچھ سعودی عرب یا گلف (Gulf) کے کسی اور ملک میں جاکر مزدوری کرنے لگے۔ کچھ نے دنیوی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ کچھ نے جائز تعویذوں اور دعاؤں کا کام شروع کر دیا۔

یہاں تک ان تبدیلیوں کی بات تھی جو اسلامی تعلیمات کی حدوں کے اندر تھیں۔ کچھ کا ردعمل (Reaction) اتنا سخت تھا کہ انہوں نے اپنی حافظانہ یا مولویانہ شناخت ہی ختم کر دی۔ انہوں نے اپنا لباس بدل دیا۔ داڑھی منڈا دی۔ نمازیں چھوڑنے لگے۔ لیکن ایسا نہیں تھا کہ وہ گمراہ ہو گئے تھے۔ بلکہ یہ ان کا اپنی عوام اور قوم کے خلاف غم و غصہ تھا جو اس شکل میں باہر نکل رہا تھا۔ کچھ نے تو یہاں تک کیا کہ انہوں نے حلال و حرام میں فرق کرنا چھوڑ دیا۔ انہوں نے ایسی مسجدوں اور مدرسوں کی رسیدیں چھپوائیں جو دنیا میں تھے ہی نہیں اور چندہ کرنے اور رسیدیں کاٹنے نکل گئے۔ اس کے لیے انہوں نے ایسے علاقوں کو پسند کیا جہاں انہیں کوئی نہ جانے، کوئی نہ پہچانے۔

دوسری طرف کچھ نے ایسی مسجدوں اور ایسے مدرسوں کی رسیدیں چھپوائیں جن کو وہ مستقبل میں بنائیں گے۔ اور انہوں نے ان سے پیسے اکٹھے کیے لیکن نہ انہوں نے کبھی مسجد بنوائی اور نہ مدرسہ۔ کچھ نے جھوٹے تعویذوں کا کام شروع کر دیا۔ میاں بن گئے۔ لوگوں کی "قسمتیں" بتانے لگے۔ ان کی تقدیریں "بدلنے لگے"۔ کبھی ٹھیک نہ ہونے والے مریضوں کو بھی "ٹھیک کرنے لگے"۔

ایسا ہو جانے کے باوجود بھی ہم عوام نے اماموں اور علما کے زخموں پر مرہم رکھنے

کے بجائے نمک ہی چھڑکا۔ یہ غلط راستوں پر جانے والے لوگ کبھی ایک فیصد سے زیادہ نہ ہوئے اور درست بات یہ ہے کہ ناجائز راستوں کو اختیار کرنے والوں میں کوئی بھی حقیقت میں عالم نہ تھا۔ ہاں انہیں عالموں کی طرح نظر آنے کا شوق تھا۔ لیکن ہم نے یہ کیا کہ ان ایک فیصد سے کم لوگوں کا گناہ جو در حقیقت عالم بھی نہ تھے دنیا کے سارے اماموں اور عالموں کے سر پر رکھ دیا۔ ہم اماموں اور عالموں کی پوری جماعت پر طنز کسنے لگے۔ کہانیاں بنانے اور سنانے لگے۔ ہم سب کو بدنام کرنے لگے اور ان کو رسوا کرنا ہمارا محبوب مشغلہ بن گیا۔

چھ ہزار میں بھی وفا نہ کی

ہم مسجدوں کے اماموں اور مدرسوں میں تدریس کے فرائض انجام دینے والے علما اور مفتیان کرام کو ان کی خدمات، محنت اور کام کے عوض میں ان کو ماہانہ چھ ہزار روپے دیتے ہیں۔ ممکن ہے کچھ علاقوں، مقامات اور شہروں میں چھ ہزار سے کچھ زیادہ دیتے ہوں لیکن پھر دوسرے کچھ علاقوں، مقامات اور شہروں میں چھ ہزار سے بھی کم دیتے ہیں۔ جیسے پانچ ہزار، چار ہزار، تین ہزار یہاں تک کہ دو ہزار۔ بلکہ بہت سے مقامات پر ان کی اجرت ان کا کھانا ہے۔ اور یہ چھ ہزار بھی ہم ان کو وقت پر یعنی جیسے ہی مہینہ پورا ہو، دے دیا کرتے تب بھی خیر تھی۔ ہم کئی بار ان کے یہ چھ ہزار بھی ایک تو پورے نہیں دیتے اور پورے دیں بھی تو متعینہ وقت سے دو دو مہینے، تین تین مہینے، چار چار مہینے تاخیر کے ساتھ دیتے ہیں۔ بلکہ کئی بار اس سے بھی زیادہ تاخیر کے ساتھ دیتے ہیں۔

بلکہ اپنی اجرت یا اپنی تنخواہ کو حاصل کرنے کے لیے مسجدوں کے اماموں کو ہر جمعے

کو لوگوں کے سامنے منت سماجت کرنا پڑتی ہے۔ وہ ان کو طرح طرح سے سمجھاتے ہیں۔ وہ کبھی قرآن و حدیث کے حوالوں سے، کبھی اسلام کی تاریخ کے حوالے سے اور کبھی علمائے کرام اور صوفیاء کرام کی زندگیوں کی کہانیاں سنا کر ہمیں یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ جس اجرت کا وعدہ ہم عوام نے انہیں ہر مہینے دینے کا کیا ہے، ان کی وہ اجرت ہم ایمانداری سے انہیں دے دیں اور وقت پر دے دیں۔ لیکن ہمارے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی، ہمیں آواز نہیں آتی۔

اور دوسری طرف مدرسوں میں علمائے کرام کو اپنی تنخواہ وقت پر اور پوری حاصل کرنے کے لیے مدرسے کے ناظم اعلیٰ کی خدمت میں جا کر منت سماجت کرنا پڑتی ہے۔ یہاں ایک دقت ہے کہ ناظم اعلیٰ کو قرآن اور حدیث کے حوالے نہیں دیے جا سکتے، ان کو اسلام کی تاریخ نہیں سنائی جا سکتی، ان کے سامنے علمائے کرام اور صوفیائے کرام کی زندگی کے واقعات اور کہانیاں نہیں رکھی جا سکتیں کیوں کہ وہ "ناظم اعلیٰ" ہیں وہ پہلے ہی سب کچھ جانتے ہیں۔ ان کے سامنے اس طرح کی باتیں کرنا گویا ان کو یہ بتانا ہے کہ ان کا علم تھوڑا ہے، ان کو رسوا کرنا ہے۔ ہاں ان کے سامنے منت سماجت کی جا سکتی ہے۔ ان کے سامنے اپنی مجبوریاں سنائی جا سکتی ہیں۔ ان کے سامنے اپنے گھر کی مشکلوں اور تکالیف کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔ تاکہ ان کا دل پگھل جائے۔ ان کو شاید رحم آ ہی جائے۔

لیکن یہ سب اپنی اجرت اور تنخواہ کو حاصل کرنے کے لیے نہیں کرنا پڑتا۔ بلکہ اس لیے کرنا پڑتا ہے کہ ان کی اجرت انہیں وقت پر مل جائے اور پوری مل جائے۔ اب اگر ناظم اعلیٰ سن لیں اور اجرت وقت پر اور پوری دینے پر راضی ہو جائیں تو یہ ان کی مہربانی ہوگی۔ ورنہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مدرسے کی رسیدیں تھما دیں اور حکم دیں کہ پہلے آپ یہ رسیدیں پوری کر کے لائیں، اس کے بعد ہم آپ کو آپ کی پوری اجرت دے دیں گے۔ اور اگر

رسیدیں پہلے ہی دی جاچکی ہیں تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اب کچھ نئی رسیدیں تھمادیں اور بولیں کہ ابھی آپ نے پچھلی رسیدیں بھی پوری نہیں کیں۔ آپ پہلے اُن کو پورا کریں اور پھر ان رسیدوں کو پورا کریں جو ابھی ہم نے آپ کو دی ہیں اور اس کے بعد آپ ہمیں ملیں، ہم آپ کا حساب پورا کردیں گے۔

ہم دین کے ایسے خادموں اور علمائے کرام کو بھی جانتے ہیں، ان سے ملتے ہیں اور ان کے ساتھ بیٹھتے ہیں جو مسجد میں امامت کی خدمت انجام دیتے ہیں اور آج بھی ان کی ماہانہ تنخواہ پندرہ سو روپے ہے۔ اور ان کی باقی پیمنٹ (Payment) چھ مہینے میں ایک بار اس وقت کی جاتی ہے جب فصل تیار ہوجاتی ہے۔ جب فصل تیار ہوجاتی ہے لوگوں کے گھروں میں غلہ آجاتا ہے تو وہ اس میں سے طے شدہ مقدار چھ مہینے میں ایک بار مسجد میں پہنچادیتے ہیں۔ اور اس میں بھی سچائی یہ ہے کہ اس مسجد میں نماز ادا کرنے والے تمام لوگ اگر اپنے حصے کا غلہ مسجد میں پہنچادیں تو یہ امام صاحب کی خوش قسمتی ہے۔

لیکن لوگ یہ غلہ بھی اتنی آسانی سے نہیں پہنچادیتے کہ ایک طرف فصل تیار ہوئی اور غلہ گھر میں پہنچا اور دوسری طرف لوگوں نے اس میں سے طے شدہ حصہ نکال کر مسجد میں پہنچادیا۔ نہیں، اس کے لیے امام صاحب کو انہیں یاد دلانا ہوتا ہے اور یاد دلاتے رہنا ہوتا ہے۔ امام صاحب کبھی مسجد میں جمعے کی نماز کی جماعت اور خطبے سے پہلے جب تمام لوگ مسجد میں موجود ہوتے ہیں تب انہیں ان کے سامنے یاد دلاتے ہیں۔ اور کبھی ان کو یاد دلانے کے لیے مسجد کے لاؤڈ اسپیکر کا ہر دن بار بار استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اگر امام صاحب ایسا نہ کریں تو اگر ان کا آدھا غلہ بھی پہنچ جائے تو یہ بڑی خوش نصیبی کی بات ہوگی۔

جن علاقوں میں اماموں کو ان کا نذرانہ یا اجرت دینے کے لیے غلہ دینے کا نظام رائج ہے وہاں ہم مسلمان اماموں پر دوہرا ظلم کرتے ہیں۔ دراصل غلے کے بارے میں سن

کر کسی کو پہلی نظر میں ایسا لگتا ہے کہ چھ مہینے کے پورا ہونے پر جب امام صاحب کو ان کا غلہ سپرد کر دیا جاتا ہو گا تو اس کو بیچ کر دہ جو رقم حاصل کرتے ہوں گے وہ بڑی موٹی رقم ہو گی۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس رقم کو جب چھ مہینوں پر تقسیم کیا جاتا ہے تو وہی چار یا پانچ ہزار روپے ماہانہ کا اوسط بیٹھتا ہے۔ تو ایسا نہیں ہے کہ امام صاحب کو ان کی اجرت غلے کی شکل میں دے کر ہم ان کو بہت رقم دے رہے ہوتے ہیں بلکہ یہ کم و بیش اتنی ہی بلکہ اس سے بھی کم رقم بیٹھتی ہے۔

ہاں اس طرح ہم ان پر ایک دوسری مصیبت اور ڈال رہے ہوتے ہیں۔ اور وہ اس طرح کہ جب ہم انہیں ان کی اجرت کیش کی شکل میں دے رہے ہوتے ہیں تو ہر مہینے ہم ان کی اجرت ان کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ لیکن ہم جب انہیں ان کی اجرت غلہ کی شکل میں دیتے ہیں تو ایک تو پہلے ہی ان کی تنخواہ بہت معمولی ہوتی ہے اور اس معمولی سی تنخواہ کو بھی ان تک پہنچانے کے لیے ہم ان کو چھ مہینے آزمائش میں ڈالے رکھتے ہیں اور چھ مہینے انتظار کرواتے ہیں۔

ایک بات اور ہے جس کے بارے میں جب کوئی بھی غور کرے گا تو حیران رہ جائے گا۔ اور وہ یہ کہ جب ہم کسی دوسرے شخص سے کوئی سامان خریدتے ہیں یا اس کو اپنے کسی کام کے لیے اپنے یہاں رکھتے ہیں یا ہم اس سے اپنا کوئی کام کرواتے ہیں اور اسے ہم اس کے اس سامان کی قیمت میں یا اس کے کام کی اجرت میں کیش (پیسے) نہ دے کر اپنا کوئی سامان دیتے ہیں اسے انگریزی میں بارٹر سسٹم (Barter System) کہتے ہیں۔ معاشیات کی تاریخ کے مطابق خرید و فروخت کی ابتدا اور اجارے کی شروعات بارٹر سسٹم کے ذریعے ہی ہوئی تھی۔

اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں نوٹ، کرنسی یا سکے وجود میں نہ آئے تھے۔

تو لوگ ایک دوسرے سے اپنی ضروریات کو اسی طرح پورا کرتے تھے کہ اگر کسی ایسے سامان کی ضرورت محسوس ہوئی جو اپنے پاس نہیں تھا تو دوسرے سے وہ سامان لے لیا اور دوسرے کو اپنا سامان جو اس کی ضرورت کا ہے دے دیا یا اس کا کوئی ضروری کام کر دیا۔ اسی طرح اگر کسی کو کسی ایسے کام کی ضرورت ہوتی جو خود اس کو نہیں آتا تو وہ اسے دوسرے ایسے شخص سے کروالیتا جس سے وہ کام آتا اور بدلے میں یا تو اس کا کوئی کام کر دیتا یا اسے اس کی ضرورت کا کوئی اپنا سامان دے دیتا۔

لیکن وقت گزرنے کے ساتھ جب سکے کی ایجاد ہوگئی اور مختلف قسم کی کرنسیاں وجود میں آنے لگیں تو دھیرے دھیرے بارٹر سسٹم رخصت ہونے لگا۔ اب لوگ اگر دوسرے لوگوں سے کوئی سامان خریدتے یا ان سے کوئی کام کرواتے تو اس سامان یا کام کے بدلے میں ان کو پیسے دیتے، کوئی سامان نہیں دیتے، نہ ہی ان کا کوئی کام کر کے دیتے۔ پھر بھی بارٹر سسٹم کا چلن صدیوں باقی رہا۔ اور بعد میں تقریباً بالکل ختم ہو گیا۔ البتہ اس طرح کے علاقوں میں جہاں ابھی بہت پسماندگی ہے اور نئے زمانے کی ترقی کی روشنی وہاں نہیں پہنچی ہے، بارٹر سسٹم ابھی بھی رواج میں ہے۔

ہمارے زمانے میں ہم نے تجارت میں، خرید و فروخت میں، اجاروں میں کہیں بارٹر سسٹم نہیں دیکھا۔ بلکہ اب تو ہم تاریخ کے اس موڑ پر ہیں جہاں اب دھیرے دھیرے کرنسی سسٹم بھی رخصت ہو رہا ہے۔ اور ہم اب کرنسی میں پیمنٹ کے بجائے ڈیجیٹل پیمنٹ (Digital Payment) کرنے لگے ہیں۔ اب ہم دوسرے سے کوئی سامان خریدتے ہیں یا کسی سے اجرت پر کوئی کام کرواتے ہیں تو سامان کی قیمت یا کام کی اجرت میں نہ تو ہم اسے اپنا کوئی سامان دیتے یا اس کا کوئی کام کرتے ہیں اور نہ ہی کسی طرح کی کوئی کرنسی اسے دیتے ہیں بلکہ انٹرنیٹ کے ذریعے سے اپنے کھاتے کے پیسے دوسرے کے کھاتے میں منتقل

کر دیتے ہیں۔

تو جو بات حیران کر دینے والی ہے وہ یہ ہے کہ بارٹر سسٹم ہمارے درمیان سے کب کا رخصت ہو گیا اور اس کی جگہ کرنسی سسٹم نے لے لی۔ اس کے بعد اب کرنسی سسٹم کا دور بھی دھیرے دھیرے رخصت ہو رہا ہے اور ہم نے ڈیجیٹل پیمنٹ کے دور میں اپنا قدم رکھ دیا ہے۔ لیکن اماموں کو ان کی معمولی سی اجرت دینے کے معاملے میں ہم آج بھی بارٹر سسٹم کو ہی چلا رہے ہیں۔ ہم آج بھی اپنی مسجدوں کے اماموں کو ان کی اجرت کرنسی یا کیش میں دینے کے بجائے غلے کی شکل میں دے رہے ہیں۔ بلکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ ہم آج کے جدید اور ترقی یافتہ دور میں اپنے اماموں اور علمائے کرام کی اجرتیں اور تنخواہیں انہیں ڈیجیٹل طریقے سے ادا کرتے۔ کیونکہ مسلمان بابصیرت ہوتا ہے۔ اسے ترقی کی رفتار میں سب سے آگے ہونا چاہیے۔

چلیے تھوڑی دیر کے لیے مان لیتے ہیں کہ اماموں کو ان کی اجرت دینے کے معاملے میں اگر ہم ابھی تک بارٹر سسٹم کو ہی چلا رہے ہیں تو اس میں کوئی پسماندگی یا پچھڑے پن کی بات نہیں ہے تو ہم اس بارٹر سسٹم کو ہی درست طریقے سے چلا لیتے۔ اس میں بھی تو ہم ان کے ساتھ وفا نہیں کر رہے ہیں۔ ایک تو ہم اماموں کے معاملے میں ابھی تک بارٹر سسٹم کو چلا رہے ہیں۔ پھر بارٹر سسٹم کے ذریعے سے بھی ہم ان کی معمولی سی اجرت مہینے میں دینے کے بجائے ان کو چھ مہینے کا لمبا انتظار کرواتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ وہ قانون کی پناہ لیں

ابھی چیزیں ہمارے ہاتھ میں ہیں۔ ہمارے اختیار میں ہیں۔ اس سے پہلے کہ چیزیں ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں اور ہمیں کچھ اختیار نہ رہے بہتر ہوگا کہ خود کو، اپنے خیالات کو اور اپنی ذہنیت کو تبدیل کرلیں۔ ہم اس بات کو ٹھنڈے دماغ سے سمجھنے کی کوشش کریں کہ مسجدوں کے ائمہ اور علمائے کرام کے لیے ہماری ذمے داریاں کیا ہیں؟ ہمارے او پر ان کے حقوق کیا ہیں؟ کیا ہم اپنی ذمے داریوں اور ان کے حقوق کو واقعی پورا کر رہے ہیں؟ کہیں ہم کسی خوش فہمی کا شکار تو نہیں ہیں؟ ایک تو پہلے ہی ہمارے نامۂ اعمال میں نیکیاں بہت کم ہیں، کہیں ایسا تو نہیں کہ دوسری طرف ہم ائمہ اور علما کے حقوق ادا نہ کرکے اپنے گناہوں میں اور بھی اضافہ کرتے چلے جارہے ہیں اور ہمیں اس کا شعور یا احساس بھی نہیں؟

در حقیقت ائمہ اور علما آج کے دور میں ایک مظلوم جماعت ہیں اور اس کے لیے ذمے دار ہم لوگ ہیں۔ یعنی ہم عوام اور ہم مقتدی۔ بلکہ تقریباً ہر مسلمان کا ہاتھ ہے ان کی اس مظلومیت میں۔ ہم ہی نے پہنچایا ہے ان کو ایسے حالات میں۔ لیکن ہمیں یہ یاد رہنا چاہیے کہ کوئی بھی مظلوم زیادہ دنوں تک خاموش نہیں بیٹھتا۔ وہ کتنا بھی کمزور ہو ایک دن کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنا دفاع شروع کردیتا ہے اور اپنے حقوق لڑ کے لیتا ہے۔

ہم اس کو مزدوروں کی مثال سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالاں کہ سماج کا مزدور طبقہ آج بھی خوشحال نہیں ہے اور اس کی پریشانیاں آج بھی ختم نہیں ہوئی ہیں۔ لیکن پہلے کے زمانے کے مقابلے میں ان کے حالات میں کچھ بہتری آئی ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ

ان کو فیکٹریوں اور کارخانوں میں اس طرح استعمال کیا جاتا تھا گویا وہ انسان نہیں کوئی سامان ہیں۔ ان سے بیسوں گھنٹے کام کروایا جاتا۔ کام کرنے کے دوران ان کو ذرا بھی آرام کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ ان سے ان کی اوقات سے زیادہ مشکل کام کروائے جاتے۔ اور نہ کرنے پر انہیں سزائیں دی جاتیں۔ ان کے ساتھ زور زبردستی کی جاتی۔ ان کے خلاف بدزبانی کی جاتی۔

ان سب مظالم کے باوجود بھی انہیں بس اتنے پیسے دیے جاتے کہ وہ ان پیسوں سے صرف ایک دن کے کھانے کا ہی انتظام کر سکیں۔ تاکہ دوسرے دن کے خرچ کے لیے ان کے پاس پیسے بالکل بھی نہ بچیں اور وہ دوسرے دن کے خرچ کا انتظام کرنے کے لیے کارخانے میں دوبارہ ضرور آئیں۔ کیونکہ اگر ان کے پاس دوسرے دن کے لیے پیسے ہوں گے تو ہوسکتا ہے وہ دوسرے دن کام کرنے کے لیے نہ آئیں، گھر بیٹھ جائیں یا کسی اور جگہ کام تلاش کرنے لگیں۔ اور اپنے اس ایک دن کے کھانے کا انتظام کرنے کے لیے بھی بچوں اور عورتوں سمیت گھر کے تمام افراد کو مزدوری کرنا پڑتی اور سب کو لگنا پڑتا۔

ایک لمبے وقت تک تو انہیں اپنی اس مظلومیت کا احساس ہی نہیں تھا۔ سورج پورب سے نکلتا ہے، درخت زمین میں اگتے ہیں اور بارش آسمان سے ہوتی ہے۔ اور یہ سب فطری چیزیں اور نظام کائنات ہے اور ان میں سے کسی بھی چیز کو بدلا نہیں جاسکتا اور ان میں کچھ غلط بھی نہیں ہے۔ مزدوروں کو لگتا کہ ویسی ہی ان کی زندگی بھی ہے۔ ان کے ساتھ جو کچھ بھی ہوتا ہے یہ سب فطری ہے اور اس میں کچھ غلط نہیں ہے۔ اور اس کو بدلا بھی نہیں جاسکتا۔ یہ سب نظام کائنات کا حصہ ہے۔

لیکن جب وہ جاگے اور ان کو اپنے خلاف ہونے والے مظالم کا شعور ہو گیا تو سڑکوں پر نکل آئے۔ انہوں نے وقت کی سرکاروں کے خلاف لڑنا شروع کر دیا۔ احتجاجات

اور مظاہرے شروع کردیے۔ دوسری طرف بہت سے مفکرین اور دانشور لوگ بھی ان کی حمایت میں کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے مزدوروں کی حمایت میں مضامین، کتابیں اور اخباروں میں کالمز لکھنا شروع کردیے۔ وکیلوں اور قانون کے جانکاروں نے بھی ان کو سپورٹ کرنا شروع کردیا۔ پہلے خود مزدوروں کو بھی پتہ نہیں تھا کہ وہ مظالم کا شکار ہیں، لیکن اب ہر گلی، ہر محلے اور چوراہے پر چرچا ہونے لگا ان کی مظلومیت کا۔ اب یہ راز راز نہ رہا بلکہ ایسا دلچسپ موضوع بن گیا جس پر ہر ایک بات کرنا چاہتا تھا۔

ان تمام کاوشوں اور محنتوں کے اثرات یہ ہوئے کہ ملک کے قوانین اور کانسٹی ٹیوشنز (Constitutions) میں مزدوروں کے حقوق پر بات کی جانے لگی۔ ان کے حق میں اسپیشل قوانین بنائے جانے لگے۔ بین الاقوامی سطح پر مزدوروں کے حقوق کے دفاع کے لیے انٹر نیشنل لیبر آرگنائزیشن (International Labour Organization) جیسے بڑے بڑے ادارے بننے لگے۔ ملکی سطح پر بھی مختلف قسم کی لیبر یونینوں (Labour Unions) کے قیام کا دور شروع ہوگیا۔ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ایسی غیر سرکاری تنظیمیں بھی وجود میں آنے لگیں جن کا مقصد مزدوروں کے حقوق کے لیے کام کرنا تھا۔ یہاں تک کہ ایسی پارٹیاں تک وجود میں آگئیں جن کی بنیاد ہی مزدوروں کے حقوق تھے۔

اسی طرح جب تک علما اور ائمہ کو اس بات کا احساس نہیں ہے کہ وہ زیادتیوں کا شکار ہورہے ہیں یا ان کو احساس تو ہے لیکن وہ بردباری، نرمی اور درگزر سے کام لے رہے ہیں اس وقت تک چیزیں ہمارے ہاتھ میں ہیں۔ جس دن وہ جاگ گئے اور انھوں نے سڑکوں پر نکل کر اپنے حقوق مانگنا شروع کردیے اور فرض کیجیے انھوں نے قانون کا سہارا لینے کی مانگ کرلی تو کچھ بھی ہمارے ہاتھ میں نہیں ہوگا۔ پھر قانون طے کرے گا کہ ایک امام، مدرس، عالم دین یا مفتیٔ دین کی تنخواہ کتنی ہوگی۔ اور پھر قانون کے ذریعے جتنی اجرت طے

کردی جائے گی اتنی اجرت کا دینا ہمارے اوپر لازم ہو جائے گا۔ جتنی اجرت یا تنخواہ قانون طے کردے گا وہ ہم کہاں سے لائیں گے؟ اس کا انتظام ہم کس طرح سے کریں گے؟ قانون ان سب باتوں کو نہیں جانتا۔ پھر ان سب چیزوں کو سمجھنا صرف ہماری خود کی ذمہ داری ہوگی۔

اسی طرح پھر قانون طے کرے گا کہ ایک امام کو یا عالم دین کو ہمیں کم سے کم کتنے سال مسجد یا مدرسے میں لازمی طور پر رکھنا ہوگا۔ پھر ہمیں اتنے سال رکھنا ہی ہوگا جتنے سال کے لیے رکھنا قانون طے کردے گا چاہے ہمیں پسند ہو یا نہ ہو۔ اگر قانون نے یہ طے کردیا کہ ایک امام یا مدرس کو زندگی بھر کے لیے یا کم از کم دس سال یا پانچ سال یا دو سال کے لیے رکھنا لازم ہے تو ہمیں پوری زندگی کے لیے یا اتنے سال کے لیے رکھنا ہی ہوگا اگرچہ ہمیں امام صاحب یا مدرس پسند نہ آتے ہوں۔ اس کے علاوہ ہمیں قانون اور سرکار کی اور بہت سی شرطوں کو ماننا اور ان پر عمل کرنا بھی لازمی ہو جائے گا۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قانون میں یہ فیصلہ کردیا جائے کہ اجرت سرکار دے گی۔

اور اجرت اگر سرکار دے گی تو پھر اس بات کا اختیار نہیں ہوگا کہ کس کو امام رکھا جائے اور کس کو نہیں۔ اس کے لیے حکومت کو اپنی طرف سے ایک نظام بنانا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس کے لیے کوئی اگزام (Exam) منعقد کرانے کا حکم جاری کردے۔ ان تمام باتوں میں ہم حکومت کے فیصلوں کے پابند ہوں گے۔ اور اجرت اگر حکومت دے گی تو اس کے لیے یا تو الگ سے امامت ٹیکس لگایا جائے گا، یا پھر کم سے کم پرانے ٹیکسوں میں اضافہ کیا جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ پھر کون امام ہوگا؟ کب تک اس کو رکھا جائے گا؟ کتنی اجرت اس کو دی جائے گی؟ اور کتنے وقت کے اندر دی جائے گی؟ یہ اور اس طرح کی تمام چیزوں میں ہمیں صرف اتنا اختیار ہوگا کہ ہم حکومت اور قانون کی بات کو سنیں اور اس پر عمل کریں۔

حالاں کہ ابھی اس بات کے امکانات کم ہی نظر آتے ہیں کہ ائمہ اور علما احتجاجات

کرنے لگ جائیں، سڑکوں پر آجائیں اور قانون اور حکومت کا سہارا لینے لگ جائیں۔ لیکن اگر ان کی مظلومیت حد سے کچھ زیادہ ہی بڑھ جائے گی اور پانی سر کے اوپر چلا جائے گا تو حالات بدلتے ہوئے دیر نہیں لگے گی اور احتجاجات، قانون اور حکومت کا سہارا لینے سے انہیں کوئی نہیں روک پائے گا۔

اگرچہ درست بات یہ ہے کہ ائمہ اور علما کا عالمانہ اور باشعور ضمیر انہیں اس بات کی کبھی اجازت نہیں دے گا کہ وہ اس طرح کی چیزوں کا سہارا لیں۔ یہ ائمہ، علما اور مفتیان کرام کی جماعت اللہ کے دوستوں کی جماعت ہے۔ یہ جماعت احتجاجات، مظاہروں اور دھرنوں کے راستوں کو کبھی نہیں اپنائے گی۔ لیکن ہم تو اپنے اپنے ضمیر کو ٹٹولیں۔ ہمارا ضمیر اتنا بے حس کیوں ہو گیا کہ ہم نے اپنے قائدوں، علما اور رہبروں کو ہی اپنے نشانے پر رکھ لیا؟ ہم انہیں کو اپنی زیادتیوں کا نشانہ بنانے لگے۔ نہ صرف یہ کہ ہم نے انہیں ان کے حقوق ادا نہ کیے بلکہ ان کو ذلیل ورسوا کرنے اور بدحال و محتاج بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ یہ سچ ہے کہ ائمہ، علما اور فاضلین کبھی دھرنوں اور مظاہروں کا راستہ نہیں چنیں گے اور نہ ہی وہ سرکار یا قانون کی مدد لینا چاہیں گے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اگر وہ ایسا کرنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں تو اس کے لیے ذمہ دار ہم خود ہوں گے۔

امام اور علما: کون ہیں یہ لوگ؟

مسجدوں کے ائمہ، دینی مدرسوں میں تعلیم کے فرائض انجام دینے والے حفاظ، قراء، مولویان، علما، فضلاء، مفتیان دین اور تنظیموں اور تحریکوں کے ذریعے سے یا ان کے بغیر دین کی خدمت اور اس کی دعوت و تبلیغ میں مصروف دین سے وابستہ افراد یہ سب

علمائے کرام کی صف میں آتے ہیں۔ شریعت کے نظریے سے عالم کا مطلب ہے وہ شخص جو دین کا علم رکھتا ہو۔ اوپر جن افراد کا بھی ذکر کیا گیا وہ سب دین کے علم، اس کی خدمت اور اس کی دعوت و تبلیغ سے وابستہ ہیں اس لیے وہ سب علمائے کرام کی جماعت میں ہی شامل ہیں، اگرچہ ان میں کچھ کے پاس علم زیادہ ہے اور کچھ کے پاس کم۔ قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں علم اور علما کے جو فضائل اور خوبیاں بیان کی گئی ہیں ان کا تعلق اوپر ذکر کیے گئے تمام لوگوں سے ہے۔ کیونکہ شریعت کی اصطلاح کے مطابق علم اصل ہے نہ کہ سرٹیفکیٹ یا ڈگری کا ہونا۔

یہاں یہ بات بھی دھیان میں رکھنا ضروری ہے کہ فضائل صرف انہیں لوگوں کے نہیں آئے ہیں جو عالم ہو چکے ہیں بلکہ وہ لوگ جو ابھی علم کی راہ میں ہیں اور طالب علم ہیں ان کا درجہ بھی اللہ و رسول عزوجل و صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں نہایت بلند ہے۔ اسلام اور شریعت کی نگاہ میں علم دین سے تعلق رکھنے والے تمام لوگ محترم اور معظم ہیں خواہ وہ علم حاصل کر چکے ہوں یا ابھی علم کی راہ میں ہوں۔ اور ویسے بھی دین کا کامل علم تو اللہ اور اس کے حبیب مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہے۔ امت کے افراد حقیقت میں طالب علم ہیں اور وہ ہمیشہ طالب علم ہی رہتے ہیں۔

ذیل میں ہم علم اور علما سے متعلق آیات مقدسہ، احادیث کریمہ اور اخبار ذکر کریں گے۔

آیاتِ مقدسہ

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۳۳﴾ (۱۳)

---

(۱۳) فصلت: ۳۳

اس سے بہتر بات کس کی ہے جو لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دیتا ہے اور نیک اعمال کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔ (ت)

یہ بات واضح ہے کہ علما نہ صرف مسجدوں میں نماز کی امامت کرتے ہیں یا مدرسوں میں تدریس اور تعلیم دینے کا کام کرتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اللہ کے دین کی تعلیمات کو لوگوں تک پہنچانے اور دعوت و تبلیغ کا کام بھی انجام دیتے ہیں۔

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ (۱۴)

اللہ تم میں سے ان لوگوں کو جو ایمان لائے بلندی عطا فرمائے گا اور ان لوگوں کو جنھیں علم سے نوازا گیا اور بھی زیادہ بلندی عطا فرمائے گا۔ اور اللہ تمھارے کاموں سے باخبر ہے۔ (ت)

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ (۱۵)

اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم! آپ ان لوگوں سے پوچھیے، کیا وہ لوگ جن کے پاس علم ہے اور جن کے پاس علم نہیں ہے دونوں برابر ہیں؟ نصیحت عقلمند لوگ ہی قبول کرتے ہیں۔ (ت)

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ؕ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ۙ وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ۝ (۱۶)

اور (اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم) کافر کہتے ہیں کہ آپ پیغمبر نہیں ہیں۔ آپ ان لوگوں سے کہیے کہ میری رسالت کے ثبوت کے لیے بطور گواہ اللہ اور وہ لوگ جن کے پاس

(۱۴) المجادلة: ۱۱

(۱۵) الزمر: ۹

(۱۶) الرعد: ۴۳

(آسمانی) کتاب کا علم ہے کافی ہیں۔ (ت)

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴿٤٣﴾ [17]

یہ کچھ مثالیں ہیں جنہیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں۔ انہیں علم والے لوگ ہی سمجھ پاتے ہیں۔ (ت)

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۭ وَ مَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ﴿٤٩﴾ [18]

بلکہ وہ واضح آیتیں ہیں جو علم والے لوگوں کے سینوں میں محفوظ ہیں۔ اور ہماری آیتوں کا انکار صرف ظالم کرتے ہیں۔ (ت)

احادیث کریمہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين. [19]

اللہ تعالیٰ جس شخص کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین کا علم عطا فرماتا ہے۔ (ت)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من سلك طريقا يطلب فيه علما سلك الله به طريقا من طرق الجنة، وإن الملائكة لتضع أجنحتهارضا لطالب العلم، وإن العالم ليستغفر

(۱۷) العنکبوت: ۴۳

(۱۸) العنکبوت: ۴۹

(۱۹) أبو القاسم الطبراني، المعجم الكبير (مكتبة ابن تيمية، قاهرة: الطبع الأول) رقم: ۸۷۵٦

له من في السماوات ومن في الأرض والحيتان في جوف الماء.[20]

جس نے علم کے حصول کے لیے کسی راستے کو طے کیا (یعنی سفر کیا) اللہ تعالیٰ اسے جنت کے راستوں میں سے ایک راستہ پر چلائے گا۔ طالب علم کی خوشی کے لیے فرشتے اپنے پَر (اس کے راستے میں) بچھا دیتے ہیں۔ اور جو آسمان و زمین میں ہیں اور پانی کی مچھلیاں عالم کے لیے بخشش کی دعا کرتے ہیں۔ (ت)

اس حدیث پاک سے علم دین کے حاصل کرنے والوں کی اہمیت کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے، اس کے ساتھ ہی حدیث پاک کے اس حصے کہ جو زمین و آسمان میں ہیں اور پانی کی مچھلیاں ایک عالم کے لیے بخشش کی دعا کرتی ہیں، سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علما سے غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ ورنہ ان کے لیے بخشش کی دعا کا کوئی معنیٰ نہیں بنتا۔ اس لیے ہمارا علما سے یہ امید رکھنا کہ وہ بالکل فرشتوں کی طرح ہوں۔ اور ان سے ایک بھی غلطی صادر نہ ہو یہ اس حدیث کی مخالفت ہے۔ اگر کسی امام یا عالم سے کبھی کوئی غلطی ہو جائے تو ہم ان کے ساتھ اس طرح کا سلوک کرتے ہیں جیسے اب ان کو زمین پر رہنے کا حق ہی حاصل نہیں رہا۔ جن لوگوں سے کسی قسم کی کوئی غلطی ہو یا گناہ ہو ان کو معاف کرنا، ان کے گناہ کو چھپانا اور ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا بھی اسلام کی تعلیمات میں سے ایک تعلیم ہے۔ اسلام کی اس تعلیم پر عمل کرنا ہمارے لیے دنیا و آخرت میں فائدے کا کام ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إن فضل العالم على العابد كفضل القمر ليلة البدر على سائر الكواكب.[21]

(۲۰) أبو داؤد السجستانی، سنن ابو داؤد (المکتبة العصرية: بیروت) رقم: ۳۶۴۱

(۲۱) أیضا

ایک علم والا شخص ایک عابد (یعنی جو شخص عبادت تو کرتا ہے لیکن اس کے پاس علم نہیں ہے) کے مقابلے میں اتنی ہی زیادہ فضیلت رکھتا ہے جتنی چودھویں کا چاند باقی تمام ستاروں پر۔ (ت)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إن العلما ورثة الأنبياء.[۲۲]

علما نبیوں کے وارث ہیں۔ (ت)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

أقرب الناس من درجة النبوّة أهل العلم والجهاد: أما أهل العلم فدلوا الناس على ما جاءت به الرسل، وأما أهل الجهاد فجاهدوا بأسيافهم على ما جاءت به الرسل.[۲۳]

نبوت کے مقام سے لوگوں میں سب سے زیادہ قریب علما اور جہاد کرنے والے ہیں۔ علما اس وجہ سے کہ وہ لوگوں تک رسولوں کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ اور جہاد کرنے والے لوگ اس وجہ سے کہ وہ رسولوں کے پیغام کی خاطر اپنی تلواروں سے جہاد کرتے ہیں۔ (ت)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

يوزن يوم القيامة مداد العلماء بدم الشهداء.[۲۴]

قیامت کے دن علما کی تحریروں کی روشنائی کو شہیدوں کے خون کے مقابلے میں تولا جائے گا۔ (ت)

---

(۲۲) أيضا

(۲۳) امام غزالی، احیاء العلوم (مترجم: صدیق ہزاروی، فاروقیہ بکڈپو، دہلی: ۱۹۹۸) ج:۱، ص:۴۳

(۲۴) ابن عبد البر، جامع بيان العلم وفضله (دار ابن الجوزي، السعودية: ۱۹۹۴ء) رقم: ۱۵۳

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

فضل العالم على العابد كفضلي على أدناكم.[25]

ایک عالم ایک عابد (بغیر علم کے عبادت کرنے والے شخص) سے اسی طرح افضل ہے جیسا میں تم میں سے سب سے ادنیٰ شخص سے افضل ہوں۔ (ت)

يشفع يوم القيامة ثلاثة: الأنبياء، ثم العلماء، ثم الشهداء.[26]

قیامت کے دن تین طرح کے لوگ شفاعت کریں گے۔ انبیاء، پھر علماء، اور پھر شہداء۔ (ت)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ما عبد الله بشيء أفضل من فقه في دين، ولفقيه أشد على الشيطان من ألف عابد، ولكل شيء عماد، وعماد هذا الدين الفقه.[27]

اللہ کی عبادت جس طرح علم دین کے ذریعے سے کی گئی اس طرح کسی اور چیز سے نہیں کی گئی۔ ایک عالم شیطان پر ہزار (بغیر علم والے) عابدوں (عبادت کرنے والے لوگوں) سے زیادہ بھاری ہے۔ ہر چیز کا ایک ستون ہوتا ہے اور اس دین کا ستون علم ہے۔ (ت)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

خير العبادة الفقه.[28]

سب سے بہتر عبادت دین کا علم ہے۔ (ت)

---

(۲۵) أبو عيسىٰ الترمذي، سنن الترمذي (مصطفى البابي الحلبي، مصر: ۱۹۷۵ء) رقم: ۲۶۸۵

(۲۶) ابن ماجة، سنن ابن ماجة (دار إحياء الكتب العربية، قاهرة) رقم: ۴۳۱۳

(۲۷) أبو القاسم الطبراني، المعجم الأوسط (دار الحرمين، قاهرة) رقم: ۶۱۶۶

(۲۸) ابن عبد البر، جامع بيان العلم وفضله (دار ابن الجوزي، السعودية: ۱۹۹۴ء) رقم: ۹۱

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

فضل المؤمن العالم على المؤمن العابد سبعون درجة.(۲۹)

ایک عالم مسلمان کو ایک عابد (بغیر علم کے عبادت کرنے والے) مسلمان پر ستر درجے فضیلت حاصل ہے۔(ت)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

بين العالم والعابد مائة درجة، بين كل درجتين حضر الجواد المضمر سبعين سنة.(۳۰)

ایک عالم اور (بغیر علم والے) عبادت گزار کے درمیان سو درجوں کا فرق ہے اور ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا ایک تیز رفتار سدھایا ہوا گھوڑا ستر سال میں طے کرتا ہے۔(ت)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

يبعث الله العباد يوم القيامة ثم يميز العلماء، ثم يقول لهم: "يا معشر العلماء، إني لم أضع علمي فيكم إلا لعلمي بكم، ولم أضع علمي فيكم لأعذبكم، اذهبوا فقد غفرت لكم.(۳۱)

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندوں کو (ان کی قبروں سے) اٹھائے گا۔ پھر علما کو الگ کرے گا اور ان سے فرمائے گا۔ اے علما کے گروہ! میں نے تمھارے اندر اپنا علم اسی وجہ سے رکھا تھا کہ میں تمھارے بارے میں جانتا تھا۔ اس وجہ سے نہیں رکھا تھا کہ میں تمھیں عذاب دوں۔ تم لوگ جاؤ، میں نے تم سب کو بخش دیا۔(ت)

---

(۲۹) أيضاً، رقم: ۹۵

(۳۰) أيضاً، رقم: ۱۲۹

(۳۱) أيضاً، رقم: ۲۳۲

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لأن تغدو فتتعلم بابا من العلم خير لك من أن تصلي مائة ركعة.[٣٢]

تم صبح میں بیدار ہو کر علم کا ایک باب سیکھنے جاؤ یہ سو رکعت نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔[ت]

اخبار شریفہ

في حديث أبي ذر الغفاري رحمه الله: حضور مجلس علم أفضل من صلاة ألف ركعة وأفضل من شهود ألف جنازة ومن عيادة ألف مريض، قيل: ومن قراءة القرآن؟ فقال: وهل تنفع قراءة القرآن إلا بعلم؟[٣٣]

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے: علم کی مجلس میں شرکت کرنا ہزار رکعت نماز پڑھنے، ہزار جنازوں میں شرکت کرنے اور ہزار مریضوں کی عیادت کرنے سے بہتر ہے۔ کسی نے کہا: کیا قرآن کی تلاوت سے بھی بہتر ہے؟ فرمایا: کیا قرآن کی تلاوت علم کے بغیر فائدہ دیتی ہے؟[ت]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا:

إن الشياطين قالوا لإبليس: يا سيدنا ما لنا نراك تفرح بموت العالم ما لا تفرح بموت العابد؟ فقال: انطلقوا، فانطلقوا إلى عابد قائم يصلي.

---

(٣٢) أيضًا، رقم: ١١٤

(٣٣) أبو طالب المكي، قوت القلوب في معاملة المحبوب ووصف طريق المريد إلى مقام التوحيد (دار الكتب العلمية، بيروت: ٢٠٠٥ء) ج: ١، ص: ٣٢

فقالوا له: إنا نريد أن نسألك، فانصرف، فقال له إبليس: هل يقدر ربك أن يجعل الدنيا في جوف بيضة؟ فقال: لا، فقال: أترونه؟ كفر في ساعة. ثم جاء إلى عالم في حلقة يضاحك أصحابه ويحدثهم، فقال: إنا نريد أن نسألك. فقال: سل، فقال: هل يقدر ربك أن يجعل الدنيا في جوف بيضة؟ قال: نعم. قال: وكيف؟ قال: يقول لذلك إذا أراد: "كن"فيكون. قال إبليس: أترون؟ ذلك لا يعدو نفسه وهذا يفسد علي عالما كثيرا. [۳۴]

شیطانوں نے ابلیس سے کہا: اے ہمارے آقا! ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ایک عابد (بغیر علم والے عبادت گزار) کی موت سے اتنا خوش نہیں ہوتے ہیں جتنا ایک عالم کی موت سے خوش ہوتے ہیں؟ اس نے کہا: تم لوگ میرے ساتھ چلو۔ وہ ایک عابد کے پاس پہنچے جو نماز پڑھ رہا تھا۔ انہوں نے اس سے کہا: ہم آپ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔ اس نے (بحالت نماز) پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ابلیس نے اس سے کہا: کیا آپ کا رب پوری دنیا کو اس انڈے میں رکھ سکتا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ ابلیس نے کہا: دیکھا آپ لوگوں نے؟ یہ ایک لمحے میں کافر ہو گیا۔

پھر وہ ایک عالم کے پاس آئے جو اپنے ساتھیوں کے حلقے میں بیٹھا ان سے گفتگو و مزاح میں مشغول تھا۔ ابلیس نے کہا: ہم آپ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔ عالم نے کہا: پوچھیے۔ ابلیس نے کہا: کیا آپ کا رب پوری دنیا کو ایک انڈے میں رکھ سکتا ہے؟ عالم نے جواب دیا: جی ہاں۔ ابلیس نے کہا: وہ کیسے؟ عالم نے کہا: وہ صرف "کن" فرمائے گا اور یہ کام ہو جائے گا۔ ابلیس نے کہا: دیکھا آپ لوگوں نے؟ عابد اپنے آپ تک محدود ہے اور یہ عالم بہت سے دوسرے لوگوں کے معاملے میں بھی مجھے ناکام بنا دیتا ہے۔ [ت]

(۳۴) ابن عبد البر، جامع بیان العلم و فضله (دار ابن الجوزي، السعودية: ۱۹۹۴ء) رقم: ۱۲۷

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا:

من آذی فقیها فقد آذی رسول الله صلی الله علیه وسلم، ومن آذی رسول الله فقد آذی الله عز وجل۔[۳۵]

جس نے کسی عالم کو تکلیف پہنچائی اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچائی۔ اور جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچائی اس نے اللہ تعالیٰ کو تکلیف پہنچائی۔ (ت)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

موت العالم ثلمة لا یسدها شيء مااختلف اللیل والنهار.[۳۶]

عالم کی موت ایک ایسا شگاف ہے کہ جب تک دن اور رات باقی رہیں گے کوئی چیز اسے بھر نہیں کر سکتی۔ (ت)

امام مقتدیوں کی عدالت میں

ہم نے اماموں اور علما کو ان کی پوری اُجرتیں اور تنخواہیں نہ دیں۔ ہم نے ان کی اجرتیں انہیں وقت پر نہ دیں۔ ہم نے ان سے پانچ ملازموں کا کام لیا اور اجرت اتنی بھی نہ دی جتنی ایک ملازم کی بنتی ہے۔ بلکہ ہم نے انہیں ایک ملازم کی تنخواہ کا بھی پانچواں حصہ

(۳۵) الخطیب البغدادي، الفقیه والمتفقه (دار ابن الجوزي، السعودیة: ۱۴۲۱ھ) ج:۱، ص:۱۴۳

(۳۶) أبو بکر البیهقي، شعب الإیمان (مکتبة الرشد للنشر والتوزیع، ریاض، بہ تعاون الدار السلفیة، ممبئی) رقم: ۱۵۹۰

دیا۔باقی چار حصے ہم نے لاپتہ کردیے۔نہ ان چار حصوں کا ہم نے کبھی کسی کو حساب دیا نہ ان کے بارے میں ہم نے کبھی کسی کو بتایا۔اور حق تو یہ ہے کہ پانچواں حصہ بھی پورا نہ دیا۔اور یہ کام ہم آج سے نہیں ایک زمانے سے کرتے آرہے ہیں۔

خیر یہ بھی اس وقت کی بات ہے جب ایک حافظ قرآن یا عالم دین کسی مسجد میں امامت حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے۔دراصل کسی مسجد میں امامت حاصل کرنے میں کامیاب ہوجانا بھی اپنے آپ میں ایک بڑا امتحان ہے۔ہر گاؤں، شہر یا بستی میں یا ہر ایک مسجد سے جڑے ہوئے مقتدیوں میں لوگوں کے کئی گروپ ہوتے ہیں۔اور ان میں سے ہر گروپ الگ الگ مزاج کا حامل ہوتا ہے۔ایک امام کو اگر کسی مسجد میں امامت حاصل کرنے میں کامیاب ہونا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسی ذات اور صفات کا مالک ہو کہ وہ ان تمام گروپوں میں سے ہر ایک کی امیدوں پر کھرا اتر سکے۔

اور ظاہر ہے یہ ایک بہت بڑی بات ہے کہ ایک انسان کے اندر وہ تمام خوبیاں ہوں کہ وہ الگ الگ مزاج کے تمام گروپوں کو مطمئن کردے۔یہی وجہ ہے کہ کتنے گاؤں اور بستیاں ایسی ہیں کہ وہاں ایک امام آتا ہے، دوسرے دن اس کی چھٹی کردی جاتی ہے۔پھر دوسرا آتا ہے اس کی تین دن میں چھٹی کردی جاتی ہے۔پھر تیسرا آتا ہے اسے پانچ دن بعد نکال دیا جاتا ہے۔پھر چوتھا آتا ہے اسے دس دن بعد واپس بھیج دیا جاتا ہے پھر کوئی اور آتا ہے اسے پندرہ دن میں رخصت کردیا جاتا ہے۔کسی کو مہینے میں، کسی کو دو مہینے میں، کسی کو چھ مہینے میں، کسی کو چھ مہینے سے کچھ زیادہ میں۔ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ایک امام صاحب ایک سال تک اپنا دفاع کرنے میں کامیاب ہوجائیں۔اور اگر کوئی امام صاحب دو سال تک اپنی امامت کی حفاظت کرپاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بہت خوش نصیب ہیں۔اور اگر ایسا ہوجاتا ہے کہ حفاظ، قراء یا علماے کرام کا ایک ہی مسجد میں امامت کا دورانیہ دو سال سے

اوپر چلا گیا تو یہ اپنے آپ میں حیرت میں ڈال دینے والی بات ہے۔

اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ کوئی بھی امام اور نہ صرف امام بلکہ مدرسوں کے مدرسین اور علماے کرام اپنی ملازمت کے حوالے سے کبھی بھی محفوظ نہیں ہیں۔ نہ تو کوئی ایسا قانون ہی موجود ہے جو اس بات کو یقینی بناتا ہو کہ ایک امام یا مدرس کو مثلاً ایک سال، دو سال یا پانچ سال وغیرہ سے پہلے بنا معقول وجہ کے برطرف نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اماموں یا علما کی کوئی ایسی تنظیم یا تحریک ہے جو ان کی ملازمت کو محفوظ بناتی ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ امامت اور تدریس دونوں ہی اتنے غیر محفوظ عہدے ہیں کہ بسا اوقات کسی امام یا مدرس سے تنہا ایک شخص کی ناراضگی بھی اس کو مسجد یا مدرسے سے باہر کا راستہ دکھا سکتی ہے۔

لیکن ہم نے یہیں پر بس نہ کیا۔ جب ہم نے ایک عالم دین یا حافظ قرآن کو اپنا امام بنا ہی لیا پھر ہم انہیں ان کی روزمرہ کی زندگی میں بھی ستانے اور تکلیف دینے لگے۔ ہم ان سے اور ان کی زندگی سے جڑی ہر چیز میں جھانکتے ہیں اور اس کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ اور نہ صرف ہم جاننا چاہتے ہیں بلکہ امام صاحب کو یہ بتانے میں دلچسپی بھی رکھتے ہیں کہ ان کی زندگی میں کیا صحیح اور کیا غلط چل رہا ہے۔ ہم انہیں ان کی زندگی کے بارے میں مشورے دینا چاہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے اماموں کو اور اپنے علما کو اتنا معصوم دیکھنا چاہتے ہیں جتنا فرشتے۔ ہماری تمنا رہتی ہے کہ ہمارے امام اور علما ایسے ہوں کہ ان سے کبھی بھولے سے بھی کسی قسم کی لغزش یا خطا نہ ہو۔ ہم ان کے ساتھ اس طرح سے پیش آتے ہیں جیسے وہ نظام کائنات کے مطابق ہر انسان کی طرح اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا نہیں ہوئے بلکہ ”آسمان سے اترے ہوں“۔ اور اسی لیے ہم ان کی کسی بھی قسم کی غلطی کو کبھی معاف کرنے کے لیے تیار نہیں۔

چونکہ ہم ان کی زندگی میں ”دلچسپی“ رکھتے ہیں، اس لیے ہم اس جستجو میں لگے

رہتے ہیں کہ ہمیں ان کی زندگی کے بارے میں کچھ جاننے کو ملے۔ اس کے لیے کبھی خود ہم امام صاحب سے براہِ راست ہی مختلف قسم کے سوالات کرتے ہیں۔ کبھی دوسرے لوگوں کے سامنے ان کے تذکرے چھیڑتے ہیں اور ان سے کچھ ہم امام صاحب کے بارے میں سنتے ہیں اور کچھ سناتے ہیں۔ اور جن جگہوں پر امام صاحب غلط ہیں ہم ان جگہوں اور ان غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اور نہ صرف نشاندہی کرتے ہیں بلکہ ہم اس تعلق سے ''دلائل'' بھی پیش کرتے ہیں کہ امام صاحب کہاں غلط ہیں اور کیوں غلط ہیں۔

اور یہ سب ہم اس لیے کرتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ امام صاحب اور تمام علما ہمارے ٹکڑوں پر پلتے ہیں۔ ہم ان پر احسان کرتے ہیں۔ اگر ہم انہیں یہ ٹکڑے نہ دیں تو ان کو اپنے گھر میں دو وقت کی روٹی بھی نصیب نہ ہو۔ ہماری سوچ یہی ہے۔ اسی حد تک گر چکی ہے ہماری سوچ۔ لیکن ہم اپنی اس بھدی سوچ کو خود سے اور دوسرے لوگوں سے چھپاتے ہیں۔

اگر ہم نے امام صاحب کو کسی دن اچھے لباس میں ملبوس دیکھ لیا تو ہم دوسرے لوگوں سے پوچھتے ہیں: کیا بات ہے آج کل امام صاحب بہت اچھا سوٹ پہن رہے ہیں؟ کہاں سے ہاتھ لگ گیا یہ جوڑا؟ پیسے کہاں سے آئے؟ اگر اتفاق سے کسی دن امام صاحب کو نکاح پڑھانے کے لیے مدعو کیا گیا اور وہاں شادی والے خاندان کے لوگوں نے ان کو نذرانے میں کچھ روپے دے دیے، تو ہم امام صاحب سے کہتے ہیں: کیا بات امام صاحب، آج تو آپ ہم سے بات کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں؟ آج آپ ہم سے بات کریں گے بھی کیوں؟ آپ کی جیب گرم جو ہو گئی ہے۔

اگر کسی امام نے اپنے لیے کہیں سے قرضہ لے کر یا کسی اور طرح اپنے لیے بائیک کا انتظام کر لیا تاکہ اگر وہ اپنے گاؤں میں ہی امامت کرتے ہیں تو ان کو ان کے گھریلو کاموں کے

لیے یا کسی دوسری جگہ امامت کرتے ہیں تو کچھ اور کاموں کے لیے سہولت ہو جائے تو ہم آپس میں ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ امام صاحب کا بائیک پر آنا جانا اچھا نہیں لگتا۔ ایک امام یا عالم کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ بائیک پر سواری کرے۔ پھر اگر ان کو اپنی امامت والے گاؤں، بستی یا شہر میں اپنے مزاج کے لوگ مل جائیں اور وہ ان لوگوں سے ملنا جلنا، ان کے یہاں اٹھنا بیٹھنا پسند کریں، تو ہم انہیں ان کی ذمہ داریاں یاد دلاتے ہیں، ہم ان کو بتاتے ہیں کہ ہم نے آپ کو یہاں امامت کے لیے رکھا ہے۔ آپ اپنے کام پر دھیان دیں۔ ادھر ادھر کی فضول باتوں میں پڑ کر وقت ضائع نہ کریں۔

ہم نماز کے لیے مسجد میں جائیں اور وضو کرنے کے لیے وضو خانے پر بیٹھیں اور ٹونٹی کھولنے پر معلوم ہو کہ ٹنکی کا پانی ختم ہو چکا ہے تو ہم وہیں سے بیٹھے بیٹھے چیخ پڑیں اور وہیں سے امام صاحب کو اس طرح آواز دیں جیسے وہ امام نہیں بلکہ پلمبر کا کام کرنے والا کوئی مزدور یا مسجد میں جھاڑو لگانے کے لیے رکھا گیا کوئی ملازم ہے۔ ہم ان کو آواز دیتے ہیں اور کہتے ہیں: امام صاحب آپ کو ذرا بھی ہوش ہے کہ نہیں؟ ٹنکی کا پانی ختم ہو گیا اور آپ کو پتہ بھی نہیں چلا۔ ویسے بھی پورا دن آپ کو کوئی کام تو ہوتا نہیں ہے۔ اگر آپ تھوڑا بہت ہوش رکھا کریں تو ٹنکی کا پانی ختم کبھی نہ ہو۔

یا اسی طرح ہم نے دیکھا کہ مسجد کی صفوں پر گرد ہے، مسجد کا دالان صاف نہیں ہے یا مسجد کے کسی اور حصے میں صفائی نظر نہیں آ رہی ہے تو ہم فوراً امام صاحب کو طلب کر لیتے ہیں اور ان سے اس طرح سوال پہ سوال کرنا شروع کر دیتے ہیں جیسے امیر گھرانوں کے مالک اپنے گھر کے نوکروں کو بٹھا کر ان سے حساب لیتے ہیں۔ یہی نہیں، وضو خانے کے ساتھ بنے باتھ روم اور ٹوائلٹ اگر گندے ہو گئے ہیں تو اس کے لیے بھی ہم مسجد کے امام صاحب یا مدرسے کے عالم دین کو کٹہرے میں کھڑا کر کے ان سے اس طرح سوالات

کرتے ہیں جیسے ان کو امام یا مدرس کے بطور نہیں بلکہ ایک "صفائی والے" کی حیثیت سے رکھا گیا ہو۔

اگر مسجد کے امام صاحب ایک دن کی چھٹی کرلیں تاکہ گھر جاکر وہ اپنے والدین، بیوی اور بچوں کی خیریت جان لیں تو بستی کا کوئی محلہ ایسا نہ بچے جس میں امام صاحب کی لاپروائی کے قصے سنے اور سنائے نہ جارہے ہوں۔ بلکہ کچھ لوگ تو ان کے انتظار میں لگ جائیں کہ کب وہ گھر سے واپس آئیں اور وہ انہیں ان کے آتے ہی انہیں ان کی ذمے داری کا احساس دلائیں اور انہیں بتائیں کہ وہ کتنے لاپرواہ ہوچکے ہیں۔ اور اگر مدرسے میں تعلیم دینے والے عالم دین ایک دن کے لیے چھٹی کرلیں تو مدرسے کی کمیٹی میں کھلبلی مچ جائے اور منصوبے تیار ہوجائیں کہ ان عالم صاحب کو جتنی جلدی ہوسکے مدرسے سے فارغ کیا جائے، ان کی غفلت حد سے زیادہ بڑھ چکی ہے۔ ان کو نہ مدرسے کی فکر ہے، نہ طلبہ کی اور نہ تعلیم کی۔ امام ہو یا عالم دین اس کی ملازمت اسی وقت سلامت رہ سکتی ہے جب وہ دن کے چوبیس گھنٹے، ہفتے کے سات دن، مہینے کے تیس دن اور سال کے تین سو پینسٹھ دن کا ہر ہر لمحہ ڈیوٹی میں خرچ کریں۔ بلکہ تب بھی کوئی گارنٹی نہیں۔

ایک عام سے عام ملازم کو بھی ہفتے میں ایک دن اپنے کام سے آرام کے لیے اور اپنے گھر والوں، والدین اور بیوی بچوں کی خیریت جاننے اور اس طرح کے دوسرے کاموں کو انجام دینے کے لیے دیا جاتا ہے جو وہ پورے ہفتے اپنی ڈیوٹی میں مصروف ہونے کی وجہ سے انجام نہیں دے سکے۔ اور اب تو بہت سے اداروں میں ہفتے میں دو دن کی چھٹیوں کا رواج آنے لگا ہے۔ لیکن یہ سب ہماری نظر میں اماموں، علما اور دین کے خادموں کے لیے غیر ضروری چیزیں ہیں کیونکہ وہ انسان نہیں بلکہ آسمان سے اتری ہوئی کوئی دوسری مخلوق ہیں۔ جن کو ان میں سے کسی بھی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی جن کی ہم کو ضرورت ہے۔ امام،

علما اور دین کے خادم لوگ مشینوں کی طرح ہیں ہم ان سے جتنا چاہیں کام لے لیں۔ یہ تھکتے نہیں ہیں۔ بلکہ مشینیں بھی ایک وقت تک چلنے کے بعد جواب دینے لگتی ہیں۔

اب ہم ذیل میں ائمہ اور علما سے متعلق حقیقی زندگی کے کچھ واقعات کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ واقعات کوئی افسانہ نہیں بلکہ سچی وارداتیں ہیں۔ ان واقعات کو پڑھ کر کچھ اندازہ ہوگا کہ ائمہ اور علما کے ساتھ ہمارا، یعنی مقتدیوں اور عوام کا رویہ کیسا ہے؟ ان واقعات کو ذکر کرتے ہوئے ہم نے ائمۂ کرام اور علمائے دین اور ان مقامات کے ناموں کو جہاں سے یہ واقعات تعلق رکھتے ہیں پوشیدہ رکھا ہے۔ تاکہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔

ایک دفعہ مسجد کے ایک امام صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ جب میں نے ان سے ان کی قابلیت (Qualification) کے بارے میں جاننا چاہا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ ملک کے ایک نامور مدرسے سے فارغ ہیں جہاں داخلہ لینے میں کامیاب ہوجانا ہی اپنے آپ میں ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ وہ نہ صرف حافظ و قاری ہیں بلکہ مولوی، عالم اور فاضل بھی ہیں۔ وہ کچھ ہی مہینے پہلے اس مدرسے سے اپنی تعلیم مکمل کرکے آئے تھے۔ وہاں سے آنے کے بعد انہیں ایک مسجد میں امامت مل گئی۔ میں نے ان کی اجرت کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ چھ ہزار روپے ماہانہ ملتے ہیں۔ حالانکہ مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ ان کا جواب کیا ہوگا لیکن پھر بھی مجھے اس بات کو جاننے میں دلچسپی تھی کہ ان کا جواب کیا ہوگا۔

انہوں نے بتایا کہ اس گاؤں میں ایک مدرسہ بھی ہے۔ میں (امام صاحب) نے سوچا کہ اس مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو کیوں نہ میں مولویت کے کورس کی کتابیں پڑھانا شروع کردوں۔ اب تک اس مدرسے میں صرف ناظرہ اور حفظ قرآن کی تعلیم ہوتی تھی۔ میں خود علوم اسلامیہ کا ایک فاضل ہوں تو کیوں نہ اس مدرسے میں مولویت کی تعلیم بھی شروع کردی جائے۔ انہوں نے بتایا کہ جب طلبہ کو تعلیم دینے کے لیے مدرسے

میں جانا شروع کیا تو کچھ ہی دن بعد ان کے مقتدیوں نے ان کو مدرسے میں جانے سے منع کر دیا۔ ان کو وجہ یہ بتائی کہ وہ انہیں ایک وقت میں دو کاموں کی اجازت نہیں دے سکتے۔ جب میں نے امام صاحب سے معلوم کیا کہ آپ کو مدرسے سے کتنے پیسے ملتے تھے؟ انہوں نے مجھے بتایا: دو ہزار روپے ماہانہ۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ کیا مولیت اور عالمیت جیسے مشکل کورسوں کی وقعت اور اہمیت اتنی ہی ہے کہ ایک عالم دین جوان کورسوں کی تعلیم طلبہ کو دینا چاہتا ہے اس کو صرف دو ہزار روپے دیے جائیں؟ دوسری بات یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ امام صاحب نے یہ خیال کیا ہو کہ چونکہ ان کو امامت سے صرف چھ ہزار روپے ملتے ہیں، اگر وہ درس نظامی (مولویت و عالمیت) کی تعلیم شروع کر دیں گے تو ان کو کچھ پیسے اور ہاتھ لگ جائیں گے۔ دو ہزار روپے اور ملا کر یہ ٹوٹل آٹھ ہزار روپے ہو جائیں گے جس کی وجہ سے ان کے حالات میں کچھ بہتری آجائے گی۔ لیکن لوگوں کو ان کی تنخواہ میں جو پہلے سے ہی بہت زیادہ نہ تھی دو ہزار روپے کی اس چھوٹی سی اور حقیر رقم کا بڑھ جانا بھی گوارا نہ ہوا۔

ایک غور طلب بات یہ بھی ہے کہ ان کو مولویت و عالمیت جیسے مشکل کورسوں کی کتابیں پڑھانے اور امامت جیسے دو محنت طلب کاموں کے بدلے میں آٹھ ہزار روپے ہی تو ملنا تھے۔ اور یہ اتنے پیسے ہیں کہ ایک مزدور ایک کام کر کے اور وہ بھی مہینے میں روزانہ صرف آٹھ گھنٹے کام کر کے ان سے ڈبل بلکہ زیادہ پیسے اپنے گھر والوں کے لیے اکٹھے کر لیتا ہے۔ پھر بھی ان لوگوں نے یہ کہہ کر ان کو مدرسہ پڑھانے سے روک دیا کہ آپ کو ہم نے یہاں امامت کے لیے رکھا ہے کسی اور کام کے لیے نہیں۔ جس کام کے لیے آپ کو رکھا ہے آپ اس کام پر دھیان دیں۔

ہمارا احساس اس قدر مر گیا ہے کہ ہم کو شعور بھی نہیں ہے کہ ہم نے علما اور اماموں

کے لیے اس زمین کو جس پر سب آزاد ہیں ایک قید خانے میں تبدیل کر دیا ہے۔ ظاہر ہے جب ہم آج کے ترقی یافتہ زمانے میں اپنے علما اور ائمہ کو اتنے بھی پیسے نہیں دیں گے جتنے ایک مزدور کے بنتے ہیں تو وہ اپنے گھر کے خرچے چلانے کے لیے یہ ضرور چاہیں گے کہ انہیں کوئی اور کام بھی مل جائے تاکہ انہیں دو چار پیسے اور ہاتھ لگ جائیں اور وہ کم سے کم دو روٹی ہی چین سے کھا سکیں۔

کیا ہم نے کبھی گن کر دیکھا ہے کہ ایسے کتنے کام ہیں جو مسجدوں کے ائمہ اور علما سے اپنی اس چھوٹی سی رقم کے عوض میں ہم اپنے لیے کرواتے ہیں؟

- اپنے گھر میں قرآن خوانیاں کروانا۔
- مختلف قسم کے موقعوں پر میلاد پڑھوانا۔
- میت کے تیجے، دسویں، بیسویں، چالیسویں اور برسی کی فاتحہ کروانا اور ان تمام موقعوں پر میلاد بھی پڑھوانا۔ نماز جنازہ پڑھوانا بلکہ بہت سی جگہوں پر میت کو غسل دلوانا اور اس کی تجہیز و تکفین کروانا بھی۔
- جب گھر میں بچہ کی پیدائش ہو تو ان سے اس کے کان میں اذان پڑھوانا۔
- عقیقہ کی فاتحہ اور میلاد کروانا۔
- نکاح پڑھوانا۔
- جمعرات کی شام میں ہر مقتدی کا امام صاحب کو اپنے گھر بلا کر فاتحہ کروانا۔
- ہر گیارہویں کو صبح سے لے کر شام تک گیارہویں کی فاتحہ کے لیے پیسے اکٹھے کروانے کے لیے مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے اعلان لگوانا اور اس سے متعلق تمام کام اور ذمے داریاں۔
- محرم کے مہینے میں ہر دن اور ہر رات مجلسیں کروانا۔

- پھر ربیع الاول کے مبارک مہینے کی تمام ذمہ داریاں جن میں جلوس نکالنا، محفلیں منعقد کرنا، گھر گھر جا کر فاتحہ خوانی کرنا اور مسجد کے لیے پیسے اکٹھے کرنا وغیرہ شامل ہیں۔
- ربیع الآخر کے مہینے میں بڑی گیارہویں کی ذمہ داریاں۔
- پھر کونڈوں اور شب براءت کے تہواروں کی الگ ذمہ داریاں۔
- پھر رمضان المبارک کے مقدس مہینے کی ذمہ داریاں جن میں سحری کے لیے لوگوں کو نہ صرف جگانا بلکہ ان کو جگائے رکھنا، پورا دن روزہ رکھنے کے باوجود عشاء کی نماز کے بعد تراویح کی بیس لمبی رکعتوں میں یا تو قرآن زبانی سنانا یا سننا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان میں اکثریت ان کاموں کی ہے جو امامت کے زمرے میں آتے ہی نہیں ہیں۔ امامت کا مطلب ہے نماز پڑھانا اور بس۔ ہم یہ سارے کام ائمہ اور علما سے لیتے ہیں اور ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہم ایک روپیہ ان کو نہ دیں۔ یا اگر دینا ہی پڑے تو اتنا دینا کافی ہے کہ کوئی دوسرا یہ نہ کہے کہ کچھ نہ دیا۔ اور اس کے لیے ہماری دلیل یہ ہوتی ہے کہ یہ سب کام فی سبیل اللہ ہوتے ہیں اس لیے امام صاحب کو کچھ نہیں لینا چاہیے۔

لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر ان تمام موقعوں پر ہم ائمہ کو اور علما کو اچھی نیت کے ساتھ کچھ دیں اس طرح کہ ہماری نیت میں ان پر کسی قسم کا احسان کرنا یا مستقبل میں احسان جتانا نہ ہو تو یہ ہماری طرف سے فی سبیل اللہ خرچ کرنا کہلائے گا۔ ہم فی سبیل اللہ خیرات کے کام کروانے کی فکر میں ہیں بھی تو دین کے ان خادموں سے جن کو پہلے ہی ہم نے فقیر بنا کے رکھا ہے۔ اور اپنے بارے میں ہم یہ بات بھول جاتے ہیں کہ ہم خود بھی فی سبیل اللہ خرچ کر سکتے ہیں۔

درست بات یہ ہے کہ ائمہ اور علما نہ کبھی فقیر اور غریب تھے اور نہ کبھی ہوں گے۔ اگر ان کے پاس کچھ بھی نہ ہو تو بھی ان سے بڑھ کر امیر کوئی نہیں۔ ہاں ہم نے ان کے حقوق انہیں پوری طرح اور ایمانداری سے ادا نہ کر کے ان کو فقیروں کی سی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے لیے ذمہ دار ہم خود ہیں اور ہمیں چاہیے تھا کہ اپنے غلط رویے کی وجہ سے ہم اپنے وجود کی طرف حقارت کی نظر سے دیکھتے۔ لیکن ہم نے خود اپنے وجود کو حقارت کی نظر سے دیکھنے کے بجائے ائمہ اور علما کو حقارت کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔

ایک گاؤں میں ایک عالم دین ایک مسجد میں امامت کرتے ہیں۔ ان کی تنخواہ پانچ ہزار روپے ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ستمبر ۲۰۲۰ء کی تنخواہ ان کو پانچ ہزار کی جگہ جو ان کی اصل تنخواہ تھی، پینتالیس سو روپے ہی دی گئی۔ وہ حیرت میں تھے کہ اس بار ان کی تنخواہ سے پانچ سو روپے کیوں کم کر لیے گئے؟ جب انہوں نے اس بارے میں اپنے مقتدیوں سے پوچھا تو انہیں بتایا گیا کہ چونکہ اس مہینے میں دودھ اور چینی ان کو مسجد کے پڑوس والے ایک مقتدی نے پہنچائی تھی اس وجہ سے ان کی تنخواہ سے پانچ سو روپے کم کر لیے گئے ہیں۔

ایک دوسرے گاؤں میں ہندوستان کے ایک عظیم مدرسے سے فارغ ایک عالم دین امامت کرتے ہیں۔ اس گاؤں کے لوگوں نے مسجد کی تعمیر میں بہت پیسہ خرچ کیا ہے۔ انہوں نے ایک بڑی عظیم الشان اور خوبصورت مسجد بنائی ہے۔ اس مسجد کے امام صاحب کے بارے میں معلوم ہوا کہ ان کو چھ مہینے سے تنخواہ نہیں دی گئی تھی۔ وجہ لاک ڈاؤن (Lockdown) بتائی گئی۔ چھ مہینے گزرنے کے بعد جب ان کا حساب کیا گیا تو انہیں ساڑھے چار ہزار روپے تھما دیے گئے۔ جب امام صاحب نے گاؤں کے لوگوں سے جاننا چاہا کہ ان کو اتنے کم پیسے کیوں دیے جا رہے ہیں؟ حالانکہ اگر تنخواہ چھ ہزار روپے ماہانہ بھی مانی جائے تب بھی چھتیس ہزار روپے بنتے ہیں۔ تو لوگوں نے ان کو بتایا کہ لاک ڈاؤن کے دوران

آپ مسجد سے پانچ ہزار روپے اپنے خرچ کے لیے پہلے ہی لے چکے ہیں۔اس طرح پانچ ہزار روپے وہ ہوگئے اور پینتالیس سو روپے یہ ہیں۔ یہ کل ملاکر ساڑھے ۹ ہزار روپے ہوگئے۔ جتنا ہم آپ سے پہلے والے امام صاحب کو دیتے تھے اسی حساب سے آپ کو بھی دیا ہے۔ہم نے کچھ غلط نہیں کیا۔

انڈیا کے اعلیٰ ترین اداروں میں سے ایک ممتاز و معروف ادارے سے فارغ علوم دینیہ کے ایک فاضل جو فی الحال اس ادارے کی مجلس شوریٰ کے رکن بھی ہیں، انھوں نے بیان کیا کہ میں ایک روز بعد نماز جمعہ اپنے والد محترم کی قبر پر فاتحہ خوانی کے بعد ان کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ایک ضلع میں مسجدوں اور مدرسوں کا جائزہ لینے اور اماموں کی خیریت معلوم کرنے نکلا۔ میرے ساتھ میں ایک قاری صاحب بھی تھے۔ شام کو مغرب کی نماز کے بعد ایک میلاد شریف میں شرکت کی، اس کے بعد ہم لوگ عشاء کی نماز کے لیے قریب کی ایک مسجد میں گئے۔ نماز سے فارغ ہوکر امام صاحب کا حجرہ دیکھ کر ہم حیرت زدہ رہ گئے۔ سخت سردی کے موسم میں بھی امام صاحب کے بوسیدہ کمرے میں دروازہ تک نہیں لگا تھا۔ امام صاحب پھاٹک کی جگہ پلاسٹک تان کر ٹھنڈ سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔

وہاں موجود لوگوں سے میں نے کہا کہ اگر پورے گاؤں کا جائزہ لیا جائے تو شاید ہی کسی مکان کے مین دروازے پر پھاٹک کی جگہ پلاسٹک تنی ملے گی۔افسوس ہوتا ہے آپ لوگوں پر! اتنی سخت سردی کے ماحول میں بھی آپ لوگوں نے اپنے امام کے کمرے کا دروازہ تک لگانے کی زحمت گوارا نہیں کی؟ ایسے تو کوئی انصاف پسند اپنے گھر کے جانوروں کو بھی نہیں رکھنا چاہتا۔خیر پھر میں نے خود ہی امام صاحب کے کمرے کے دروازے کا ناپ لیا اور ان سے کہا کہ ان شاء اللہ کل ہی آپ کے دروازے پر ہم اپنی طرف سے ایک کاریگر بھیج کر مضبوط قسم کا پھاٹک لگوادیں گے۔

فاضل مذکور کا ہی بیان ہے کہ ایک مرتبہ اسی ضلع کے حلقے میں واقع ایک مسجد کے امام صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ امام صاحب گزشتہ ۹/ سال سے وہاں امامت اور طلبہ کو دینی تعلیم دینے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ وہ اس کے علاوہ آس پاس کے علاقوں میں بھی دینی کاموں کے سلسلے میں آنا جانا رکھتے ہیں۔ جب انہوں نے امامت شروع کی تھی گاؤں والوں نے ان کی تنخواہ ۳/ ہزار روپے طے کی تھی۔ ان کو امامت کرتے ہوئے ۹/ سال ہوگئے ہیں اور اب ان کی تنخواہ ۲۳/ سو روپے ہوگئی ہے۔ میں نے ۲۳/ ہزار کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ ۲۳/ سو ہی استعمال کیا ہے۔ ہر سال امام صاحب کی رمضان شریف کی پوری تنخواہ غائب کر دی جاتی ہے اور اپنی یہ ۲۳/ سو روپے کی تنخواہ بھی امام صاحب کو مقتدیوں کے دروازوں پر جاکر خود ہی وصول کرنا پڑتی ہے۔

کسی کے ذہن میں یہ بات بھی آسکتی ہے کہ ہوسکتا ہے امام صاحب علمی طور پر قابل اور باصلاحیت نہ ہوں۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے وہ مدرسہ تعلیمی بورڈ سے ڈبل فاضل اور ایک مرکزی ادارے سے سند یافتہ فاضل ہیں۔ وہ ایک اچھے خطیب اور بہترین ادیب بھی ہیں۔ عصری علوم میں ٹی ای ٹی (TET) پاس ہیں. ان کے گھر والوں میں کئی بیٹیاں ہیں، بیٹا ہے، بیوی اور ضعیف ماں بھی ہیں۔ اور سب کی ذمے داری انہیں کے سر پر ہے۔ مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ تنخواہ ۲۳ سو روپے ہی ہوگی، لیکن جب میں نے مسجد کی تنخواہ کا رجسٹر دیکھا تو سارا شک ہوا میں اڑ گیا۔

ایک طالب علم جو ایک بڑے مدرسے میں تعلیم حاصل کر رہا تھا، اچانک اس نے تعلیم چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ مدرسے میں دین کی تعلیم حاصل کرتے ہوئے اسے دو تین سال ہو چکے تھے۔ جب اس سے کسی نے پوچھا کہ اس نے ایسا فیصلہ کیوں لیا؟ تو اس نے بتایا کہ اس کے والد ایک عالم دین ہیں۔ وہ ایک مسجد میں امامت کرتے ہیں۔ ان کو تیس سے زیادہ

سال امامت کرتے ہوئے ہو گئے ہیں۔ اس کی تمام بہنیں قرآن کی حافظہ ہیں۔ ان میں سے کسی نے آج تک کسی غیر محرم کو نہیں دیکھا ہو گا۔ وہ بڑی ہو چکی ہیں۔ ان کے رشتے کے لیے لوگ آتے ہیں اور پھر جا کر کبھی واپس نہیں آتے، کیونکہ ہم مسجد کی چھت پہ رہتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک خاتون ہمارے یہاں رشتے کے حوالے سے آئی، لیکن چھت پر چڑھتے ہوئے اس نے یہ کہہ کر رشتے سے انکار کر دیا کہ یہ لوگ مسجد میں رہتے ہیں، میرا بیٹا سسرال آئے گا تو دوستوں کو کہاں بٹھائے گا؟ میرے والد نے منت کی کہ ایک بار چھت پر چل کر دیکھ تو لیں، لیکن اس نے کچھ بھی سننے سے انکار کر دیا۔

لڑکے نے بتایا کہ آج تک ہمارے پاس اپنا گھر بھی نہیں ہے۔ والد صاحب کو جو اجرت ملتی ہے اس سے ہماری بنیادی ضرورتیں بھی پوری نہیں ہو پاتیں۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا گذارا کیسے ہوتا ہے۔ میرے پاس اب تعلیم چھوڑ کر کسی کام پر توجہ دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ اگر میں نے ایسا نہیں کیا تو تنگدستی کے ان حالات سے ہم کبھی نہیں نکل پائیں گے۔

یہاں ہم نے بطور مثال دو تین واقعات بیان کر دیے ہیں۔ ائمۂ مساجد اور علمائے کرام کی مظلومیت کی داستانیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کو بیان کرنے کے لیے الگ سے ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔ یہ گاؤں گاؤں، ہر شہر، ہر محلے اور ہر بستی کی کہانی ہے۔ یہ صرف ہندوستان اور پاکستان کا مسئلہ نہیں، بلکہ کوئی علاقہ ایسا دکھائی نہیں دیتا جہاں ائمہ اور علما کو ایسی زندگی گزارنے کا موقع فراہم کیا جا رہا ہو کہ وہ اپنی زندگی میں واقعی دل سے اور اندر سے مطمئن ہوں۔

حالات تو اتنے سنگین ہو چکے ہیں کہ پھر ایک دن یہ خبر بھی آئی کہ ایک مسجد کے امام صاحب نے خودکشی کر لی۔ یہ بات اتر پردیش کے ایک ضلعے کی ہے۔ لاک ڈاؤن کے

دوران امام صاحب کی مسجد سے چھٹی کردی گئی۔اس کے بعد امام صاحب پر قرضہ ہوگیا۔گھر میں کھانے کے لیے بھی پیسے نہیں بچے۔انہوں نے اپنے بچوں کو گھر سے باہر کھیلنے کے لیے بھیج دیااور بیوی کو کسی پڑوسی کے گھر سے آٹالانے کے لیے بھیج دیا۔جب تک بیوی اور بچے واپس آئے تب تک ان کی موت واقع ہوچکی تھی۔

کس نے مارا تھاان امام صاحب کو؟کون ہے ان کی موت کا ذمہ دار؟کیاانہوں نے خود کو مار لیایاان کی اس موت کے لیے ان کے مقتدی بلکہ پوری مسلم قوم اور امت ذمے دار ہے؟کیاخودکشی انہوں نے اپنی خوشی سے کی یاامت نے اپنے مقتداؤں،حفاظ،ائمہ اور علما کی ساری برادری کے لیے دنیاکواتناتنگ بنادیاہے کہ ان کے لیے سانس لینابھی مشکل ہوگیا ہے؟اور نوبت یہاں تک آپہنچی کہ اب وہ اس دنیاکو خیر آباد کہنے کا ہی فیصلہ لینے لگے۔کیایہ واقعی خودکشی تھی یامسلم قوم کا اپنے امام پر ایک حملہ تھا؟اور کیا یہ حملہ صرف امام پر تھایا پورے دین پر تھا؟اگر دین کے علما اور ائمہ ہی دنیامیں نہیں بچیں گے توکیادین بچ جائے گا؟

ایسے ہی ہیں زمینی حالات ائمہ،علما اور قوم کے رہبروں کے لیے۔اتنی ہی تنگ کردی گئی ہے یہ دنیاان کے لیے۔یہ الگ بات ہے کہ ایسے حالات میں بھی وہ کبھی شکوہ اپنی زبان پر لانے کو حلال نہیں سمجھتے۔جب پوچھو ہمیشہ اللہ رب العزت کا شکر ادا کرتے ہیں اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔اور عوام اور لوگوں کو ذمے دار قرار دینے کے بجائے وہ یہ مانتے ہیں کہ وہ اپنے حالات کی ابتری کے لیے خود ذمے دار ہیں۔وہ سمجھتے ہیں کہ شاید ان کی خود کی خطائیں،غلطیاں اور لغزشیں ہیں جن کی وجہ سے وہ ایسی زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔

علما نے خود کو کیوں نہیں بدلا؟

ہمارے ذہنوں میں کئی بار یہ باتیں بھی آتی ہیں کہ علما نے آج تک خود کو بدلا کیوں نہیں؟ دنیا کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی اور یہ ابھی تک وہیں کے وہیں ہیں۔ پرانے زمانوں کی باتیں کرتے ہیں۔ ان کے خیالات، ان کی باتیں اور ان کے مزاج سب وہی پرانے زمانے والے ہیں۔ دنیا بہت آگے جا چکی ہے۔ انہیں خبر ہی نہیں ہے۔ ان کو سمجھنا چاہیے کہ یہ اکیسویں صدی ہے۔ اب بہت کچھ بدل چکا ہے۔

یہ لوگ مدرسوں اور دوسرے دینی اداروں کو نئے طریقے سے کیوں نہیں چلاتے؟ یہ دین کی باتوں، پیغام اور تعلیمات کو نئے طریقے سے پیش کیوں نہیں کرتے؟ یہ دینی کاموں کے لیے نئی ٹیکنالوجی اور سائنسی ایجادات کا استعمال کیوں نہیں کرتے؟ ان کے پاس ہمارے زمانے کے نئے نئے سوالوں کے تشفی بخش جوابات کیوں نہیں ہیں؟ اور دنیا کی تو انہیں خبر ہی نہیں ہے کہ اس میں ہو کیا رہا ہے؟ انہیں نہ سیاست کی خبر ہے، نہ معیشت کی خبر ہے۔ نہ انہیں یہ اطلاع ہے کہ سماج اور معاشرے کی اقدار کس قدر بدل چکی ہیں۔ یہ کسی اور دنیا کے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے مزاج میں سختی ہے۔ یہ ہٹ دھرم بھی ہیں۔ صرف اپنی سناتے ہیں، کسی دوسرے کی سننا نہیں چاہتے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ جو لوگ دین سے تعلق رکھتے ہیں ان میں سے کسی کے اندر بھی ان میں سے کوئی خامی نہیں ہے۔ لیکن ہمیں یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ بھی نہیں ہے کہ اگر ان کے اندر یہ برائیاں ہیں تو اس کے اصل ذمہ دار ہم عوام ہیں۔ اس کی ذمہ دار مسلم قوم خود ہے۔ اس کے پیچھے اداروں، مسجدوں اور مدرسوں کی وہ کمیٹیاں، ان کے صدر، خزانچی،

سکریٹری اور ممبران ہیں جن کے کاندھوں پر اداروں اور مسجدوں کے انتظام و انصرام کی ذمہ داریاں ہیں۔

ہم عوام نے اور ہماری کمیٹیوں نے علمائے دین کو، اماموں کو اور دین کی خدمت کرنے والوں کو ان کے کاموں اور خدمات کا کبھی اتنا معاوضہ نہ دیا جس سے وہ اپنا، اپنی بیوی اور بچوں کا اور اپنے گھر والوں کا پیٹ بھر لیتے۔ وہ اپنے گھر کی بنیادی ضروریات کو کبھی اطمینان بخش طریقے سے پورا نہ کر سکے۔ اور جب پیٹ بھرا ہوا نہ ہو اور ایک انسان کی بنیادی ضروریات ہی ٹھیک سے پوری نہ ہوتی ہوں تو ایسے انسان کی ساری توجہ اپنے اور اپنے گھر والوں کا پیٹ بھرنے اور اپنی اور ان کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے میں لگی ہوتی ہے۔ وہ اپنے خود کے وجود کو سلامت رکھنے کی فکر اور جدوجہد میں لگا رہتا ہے۔ اس کا ذہن، دماغ اور دل اسی میں لگے رہتے ہیں کہ کھانے، کپڑے اور مکان کے انتظامات کیسے کیے جائیں۔ ان کے پاس نہ اتنا وقت ہوتا ہے اور نہ اتنی ہمت اور نہ اتنے وسائل کہ دوسرے لوگوں، امت یا قوم کے بارے میں فکر و تدبر کر سکیں۔ وہ زوال کی شکار قوم کے حالات کے بارے میں سوچ سکیں۔ وہ اس طرح کے منصوبے تیار کر سکیں کہ قوم کی ڈوبتی کشتی کو پار لگا دیں۔

وہ صرف اپنی سلامتی اور بقا کی جنگ لڑ رہے ہوتے ہیں۔ وہ قوم کی سلامتی اور بقا کے بارے میں سوچنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ وہ اپنے گھر والوں اور اپنے بچوں کی ترقی کے بارے میں نہیں سوچ پاتے تو پھر وہ قوم کی ترقی اور اس کے عروج کے لیے منصوبے تیار کرنے اور ان منصوبوں کو زمین پر اتارنے کا خواب کیسے دیکھ سکتے ہیں؟ وہ بدلتے ہوئے زمانے کے حساب سے اپنے گھر والوں اور اپنے بچوں کی ترقی کی خواہشات کو پورا کرنے کی طاقت اور ہمت اپنے اندر نہیں رکھتے تو قوم مسلم کے اداروں، مسجدوں اور مدرسوں کو نئے

زمانے کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی سمجھ انہیں کہاں سے آئے گی؟

یہ ہماری غلطیوں کا نتیجہ ہے کہ وہ قوم، ملت، امت، مذہب اور دین کے بارے میں یا تو سوچ ہی نہیں پاتے یا اگر سوچ پاتے ہیں تو جدید تقاضوں کے مطابق سوچنا نہیں آتا۔ اگر ہم علمائے دین کو اور دین کے خادموں کو ایک معقول اجرت اور تنخواہ دے رہے ہوتے، اگر ہم انہیں ان کی تنخواہ کا محض پانچواں حصہ دینے کے بجائے ان کی پوری تنخواہ انہیں دے رہے ہوتے اور ان کے حقوق ان کو پوری طرح ادا کر رہے ہوتے تو حالات اس قدر خراب نہ ہوتے۔ اگر دین کے خادموں اور علمائے دین کو ہم نے اتنی اجرت دی ہوتی کہ وہ اپنی، اپنے بیوی بچوں کی اور اپنے تمام گھر والوں کی زندگی کے بارے میں اطمینان اور خوشی محسوس کر رہے ہوتے تو ان کے پاس خود کی اور اپنے گھر کی فکروں کو چھوڑ کر دوسرے لوگوں، سماج، معاشرے، قوم مسلم اور ملت اسلامیہ کے عروج اور زوال، ان کے حالات، ان کی قسمت اور ان کے مستقبل کے بارے میں سوچنے اور غور و فکر کرنے کے لیے وقت بھی ہوتا، ہمت اور حوصلہ بھی اور وسائل بھی۔ ان کے پاس نئی نسل کے تمام پیچیدہ سوالوں کے جواب بھی ہوتے اور لوگوں کی قسم قسم کی مشکلوں اور پریشانیوں کو دور کرنے کے سامان بھی۔ وہ مسلمانوں کے اداروں، ان کے مدرسوں اور ان کی مسجدوں کو نئے زمانے کے تقاضوں سے لیس کر دیتے اور ان کو نیا رنگ، نئی چمک اور نئی خوبصورتی بھی دیتے۔ ان سب چیزوں کا مجموعی فائدہ یہ ہوتا کہ مسلمان ایک پسماندہ اور زوال کا شکار قوم نہ ہوتے، ان کے حالات اتنے برے نہ ہوتے جتنے آج ہیں۔ وہ وقت کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر چلنے والے لوگ ہوتے۔ وہ اپنے مستقبل کو خود لکھنے والے لوگ ہوتے۔

یہ بات سچ ہے کہ اگر ہم نے علمائے دین اور دین کی خدمت کرنے والے لوگوں کی حالت یہ نہ بنائی ہوتی اور انہیں ان کے حقوق ادا کیے ہوتے تو یہ علما ہمارے حقوق ادا کر رہے

ہوتے۔ انہوں نے ہمیں زوال سے نکال کر عروج اور ترقی کی سیڑھیوں پر لا کر کھڑا کر دیا ہوتا۔ یہ ہر وقت ہمارے بارے میں اور ہمارے حالات کے بارے میں سوچ رہے ہوتے اور ہماری ترقی کے لیے طرح طرح کے منصوبے بنا رہے ہوتے۔

ہم نے پچھلے پندرہ بیس سالوں کا ریکارڈ دیکھا ہے۔ ان پندرہ بیس سالوں کے عرصے میں مدرسوں کے بہت سے وہ طلبہ جن کو محسوس ہوا کہ مدرسے کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اگر انہوں نے مسجد یا مدرسے کو ہی اپنے مستقبل کا ٹھکانہ بنایا تو وہ کبھی مشکلات بھری زندگی سے نکل نہیں پائیں گے اور ان کی زندگی میں سکون اور خوشحالی آنے کے بجائے وہ تکلیفوں کی پہلے سے زیادہ پیچیدہ اور گہری بھنور میں پھنس جائیں گے، تو انہوں نے خود کو مسجد اور مدرسے پر موقوف نہیں رکھا، انہوں نے اپنی زندگی کے لیے دوسرے ذرائع اپنائے اور خود کو خود کفیل بنایا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ان میں سے کچھ نے اپنی دینی تعلیم مکمل کرنے کے بعد دنیوی تعلیم کے اداروں کا رخ کر لیا۔ انہوں نے وہاں داخلے لے لیے۔ اس طرح دین کا علم تو ان لوگوں کے پاس تھا ہی اب دنیوی علوم کا سرمایہ بھی ان کے پاس ہو گیا۔ دنیوی تعلیم کے ادارے سے فراغت کے بعد جب ان کو معقول دنیوی ملازمتیں ملیں اور معقول اجرتیں ملنا شروع ہوئیں اور انہوں نے اپنی زندگی میں اپنے لیے اور اپنے گھر والوں کے لیے سکون اور خوشی کو محسوس کیا تو انہوں نے اپنے اندر ہمت بھی پائی اور طاقت اور وقت بھی قوم مسلم کے بارے میں سوچنے اور غور و فکر کرنے کے لیے۔

ہم یہ تو نہیں کہتے کہ ان میں سے ہر ایک نے سب کچھ چھوڑ کر قوم مسلم کے بارے میں سوچنا اور امت کی فکر کرنا شروع کر دیا۔ لیکن ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے ایک طبقے نے امت مسلمہ کے حالات کو ایک نئے نظریے سے دیکھنا شروع کیا ہے۔ انہوں نے اکیسویں صدی کے تقاضوں کو سمجھنا شروع کیا ہے۔ ان کو اس بات کی سمجھ آنے لگی ہے کہ

ہماری قوم کے بیمار پڑے جسم کو کیا کیا اور کتنی بیماریاں لگی ہیں؟ ان کو اس بات کی پہچان ہونے لگی ہے کہ کون سے وہ حصے ہیں جہاں مرمت اور اصلاح کی ضرورت ہے اور کون سے وہ حصے ہیں جن کو اسی طرح باقی رکھنے کی ضرورت ہے؟

ہمارا مقصد یہ کہنا بھی نہیں ہے کہ ان لوگوں نے اچانک انقلاب بپا کر دیا ہے اور انہوں نے قوم مسلم میں ایک بڑے پیمانے پر بیداری پیدا کر دی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ ابھی اپنے سفر کی ابتدا میں ہیں اور منزل بہت دور ہے۔ اگرچہ ابھی انہوں نے کوئی بہت بڑے کارناموں کو انجام نہیں دیا ہے لیکن جس راستے سے سفر کی ابتدا ہوتی ہے اس پر اپنا قدم رکھنے میں ضرور کامیاب ہو گئے ہیں۔ اور آثار اس بات کی پیشین گوئی کر رہے ہیں کہ یہ لوگ اپنی منزل کو ضرور پہنچیں گے اور ان کی منزل امت مسلمہ کی مشکلوں اور مصائب کو جڑ سے مٹانا اور اس کی دینی اور دنیوی زندگی کو کامیاب، خوشحال اور ترقی یافتہ بنانا اور قوم مسلم کو مظلوم قوموں کی فہرست سے نکال کر دنیا کی قیادت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں دینا ہے تاکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا ہو سکے۔

ہمارا مقصد یہ بھی نہیں ہے کہ جن طلبہ نے مدرسے کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد دنیوی تعلیم کو حاصل نہ کیا انہوں نے دین کا کام نہیں کیا یا انہوں نے کسی دینی خدمت کو انجام نہیں دیا۔ ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ پہلے بھی دین کے اصل محافظ وہی تھے اور آج بھی اس کے اصل محافظ وہی ہیں۔ ہوا یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں، جیسا کہ اوپر اس بات کا ذکر کیا گیا، ان کو اتنا بے بس بنا دیا گیا کہ وہ کبھی اپنے آپ سے اور اپنی خود کی زندگی سے ہی نہیں نکل پاتے۔ ان کے پاس نہ اتنا وقت ہے، نہ ہمت، نہ ذرائع کہ وہ قوم مسلم کے بارے میں سوچ پاتے۔

مقصد دنیوی تعلیم کے اداروں میں تعلیم حاصل کرنے والے علما کی مثال سے صرف اس بات کو واضح کرنا ہے کہ کچھ علما نے خود کو دوسرے طریقے سے کس طرح خود کفیل

بنانے کی کوشش کی اور خود کفیل ہونے کی وجہ سے ان کو قوم کے بارے میں سوچنے اور غور کرنے کی ہمت اور طاقت کیسے ملی۔

ایسے علمائے کرام کی ایک لمبی فہرست ہے بلکہ وہی تعداد میں زیادہ ہیں جن میں سے کسی نے نہ تو دنیوی ادارے میں تعلیم حاصل کی اور نہ ہی کسی اور طور پر دنیا کا سہارا لیا۔ اس کے باوجود انہوں نے دین کے تحفظ و ارتقاء کے لیے اپنی زندگیوں کو وقف کیا ہوا ہے۔ وہ دین کی تعلیمات، اس کے پیغام اور اس کی برکات کو لوگوں تک پہنچا رہے ہیں۔ تاہم یہ وہ لوگ ہیں جو یہ سب کچھ اپنی خود کی محنت، اپنی جدو جہد اور اپنی جانفشانی سے کر رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ قوم نے ان سے یہ کہہ دیا ہو کہ آپ دین کے تحفظ اور اس کے ارتقاء کے لیے کام کیجیے، ہم ہمیشہ آپ کی مدد کے لیے آپ کے ساتھ یا آپ کے پیچھے کھڑے ہیں۔ نہیں، بلکہ وہ تو جو کچھ بھی کر رہے ہیں خود سے کر رہے ہیں، اپنے خود کے حوصلے اور ہمت کی بنیاد پر کر رہے ہیں۔

ایک جان پر ہزار ذمے داریاں

یہاں ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ مسجد کے امام یا کسی مدرسے میں تعلیم دینے والے عالم دین سے ہم کتنا کام لیتے ہیں جس کے بدلے میں ہم انہیں چھ ہزار روپے دیتے ہیں۔ پہلے ہم امام کے بارے میں جانتے ہیں۔ ایک امام مسجد میں رہتے ہوئے نہ صرف امامت کے فرائض انجام دیتا ہے بلکہ امامت کے علاوہ بھی بہت سی ایسی ذمے داریاں ہیں جو ہم نے اس کے اوپر ڈالی ہوئی ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ امامت کے

فرائض سے بھی زیادہ مشکل ہوتی ہیں اور ان ذمے داریوں کو پورا کرنے کے لیے اس سے بھی زیادہ وقت کی ضرورت ہوتی ہے جتنے وقت کی ضرورت امامت کے فرائض ادا کرنے کے لیے ہوتی ہے۔

لوگ چاہتے ہیں کہ مسجد کی تمام صفیں، اس کی تمام دیواریں، فرش، اس کی ہر منزل اور چھت، مسجد کے آگے سے گزرنے والا راستہ اور مسجد میں رکھی ہوئی تمام کتابیں، کلام پاک کے تمام نسخے، مسجد میں رکھی ہوئی یا دیواروں میں بنی ہوئی تمام الماریاں اور ان میں رکھے تمام سامان، منبر، امام کے نماز پڑھانے کی جگہ، مسجد کا حجرہ اور اس میں رکھے ہوئے تمام سامان، وضو خانہ، باتھ روم اور ٹوائلٹ اس طرح صاف ہوں کہ ان میں سے کسی پر گندگی بلکہ گرد کا نام و نشان بھی نہ ہو۔

ہم امید کرتے ہیں کہ یہ سارے کام امام صاحب خود انجام دیں یا پھر اپنے یہاں پڑھنے والے بچوں اور طلبہ سے یہ کام کروائیں۔ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ صفائی کا کام خود کرنا یا کسی کی مدد سے کروانا مستقل ایک الگ ملازمت ہے۔ جس کے لیے نہ صرف الگ ملازم کی ضرورت ہے بلکہ اس کے لیے الگ بجٹ اور فنڈ کی بھی ضرورت ہے۔

مسجد یا مدرسے کے علاوہ کوئی دوسرا ادارہ ایسا نظر نہیں آتا جس میں صفائی کا کام وہ لوگ کرتے ہوں جن کی تقرری اس ادارے کے اصل اور بنیادی کاموں کو کرنے کے لیے ہوئی ہو۔ کوئی سرکاری دفتر ایسا نظر نہیں آتا جس میں خود آفیسر صفائی کرتا ہو یا صفائی کے کام پر نظر رکھتا ہو۔ یا ایسا کوئی اسکول، کالج یا یونیورسٹی نظر نہیں آتی جس میں خود ٹیچرس پر صفائی کی ذمے داری ہو۔ حکومت کا کوئی محکمہ ایسا دکھائی نہیں دیتا جس میں کام کرنے والے انجینئر، ڈاکٹر، کلرک یا اسٹینو وغیرہ پر صفائی کی بھی ذمے داری ہو۔ اس کام کے لیے ہر دفتر، محکمے اور ادارے میں الگ بجٹ اور فنڈ ہوتا ہے اور الگ سے مستقل ملازم ہوتے ہیں۔ ہاں مسجد کے

امام سے ہم یہ کام مفت میں کرنے کی امید رکھتے ہیں اور کرواتے بھی ہیں۔

مسجد کے ارد گرد گھروں، محلوں اور گلیوں میں ہونے والی تمام قرآن خوانیاں، میلاد خوانی کی محفلیں، عید و بقر عید، دسویں محرم، بارہ ربیع الاول شریف، بڑی گیار ہویں، ہر مہینے کی گیار ہویں، کونڈے اور شب براءت کے مواقع پر اور ہر جمعرات کی شام فاتحہ خوانی کرنا اوران تمام موقعوں سے جڑی دوسری ذمے داریاں۔ عید الاضحیٰ کے موقعے پر فاتحہ خوانی سے پہلے جانور ذبح کرنا۔ بچہ کی پیدائش سے متعلق تمام دینی رسم ورواج جیسے اذان دینا، نام رکھنا، عقیقہ کی ذمہ داریاں، اگر کہیں موت ہوجائے تو نماز جنازہ، بلکہ بہت سے علاقوں میں غسل دینا اور کفن پہنانا بھی، خاص موت کے دن کی فاتحہ، سوم، دسویں، بیسویں، چالیسویں اور برسیوں کی ذمہ داریاں۔ نکاح وطلاق کے معاملات کو سنبھالنا اور کبھی سلجھانا۔ اس کے علاوہ ہم مقتدیوں کی زندگی اور اس سے جڑے بہت سے اور مسائل کی نگرانی اور ان کی ذمہ داری۔ یہ سب ذمے داریاں ہم نے اماموں کے کاندھوں پر رکھی ہوئی ہیں۔

جو لوگ بزنس، کاروباری دنیا اور معاشیات کے علم کی تھوڑی بہت بھی جانکاری رکھتے ہیں وہ اس بات کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ اتنے سارے کاموں کے لیے الگ سے ایک ملازم کی ضرورت ہے اور اس کو ایک معقول تنخواہ دیے جانے کی ضرورت ہے۔ لیکن ہم یہ تمام کام اماموں سے لیتے ہیں اور اس کے عوض میں ہم انہیں کوئی اجرت بھی نہیں دیتے ہیں۔ ہاں ہم انہیں کبھی کبھی ان کاموں پر نذرانے ضرور دیتے ہیں۔ اور نذرانوں کے معاملے میں ہمیں اختیار ہوتا ہے چاہیں تو ہم دیں اور چاہیں تو نہ دیں۔ اور دیں تو ہمیں اختیار ہے جتنا چاہیں اتنا دیں۔ اور اگر دیں تو امام صاحب کے اوپر یہ ہمارا بہت بڑا احسان ہوتا ہے۔ اور اگر ہم نے دے دیا تو چونکہ ہم نے امام صاحب کے اوپر ایک احسان کیا ہوا ہے تو ہمیں اس بات کا بھی اختیار ہے کہ ہم جب چاہیں ان کی طرف اس طرح سے دیکھیں جیسے کوئی آقا

اپنے غلام کو دیکھتا ہے۔

اس کے علاوہ اپنی تنخواہ، مسجد اور مدرسے کے مختلف کاموں جیسے مرمت، بلڈنگ میں اضافے اور خاص موقعوں پر رنگ کروانے کے اخراجات کے لیے پیسوں کا انتظام کرنا، ہر مہینے گیارہویں شریف، دسویں محرم، بارہ ربیع الاول شریف، بڑی گیارہویں، شب براءت، شب معراج، کونڈے، رمضان کے مہینے، ختم قرآن، عید الفطر اور عید الاضحیٰ سے جڑے مختلف قسم کے پروگراموں کے اخراجات اور دیگر قسم کے اخراجات کے لیے فنڈ اکٹھا کرنا، ساتھ ہی مسجد کے تحت چلائے جانے والے مدرسے کے ہر قسم کے خرچوں کے لیے پیسے اکٹھا کرنا، ان کا حساب وکتاب رکھنا، اپنے مقتدیوں کو ایک ایک پیسے کا حساب دینا، بجٹ کی نگرانی کرنا، اس کی حفاظت کرنا، اس کو بڑھاتے رہنے کی فکر کرنا یہ سب کام بھی امام صاحب کے ذمے ہی ہیں۔

اس کے لیے کبھی امام صاحب کو مسجد ہی میں جمعہ کے دن لوگوں سے فریاد اور ان کے آگے منت سماجت کرنا ہوتی ہے اور کبھی گھر گھر جاکر لوگوں کے دروازوں پر بہت عاجزی اور انکساری کے ساتھ دستک دینا ہوتی ہے۔ اور ان تمام کاموں کے لیے جو بھی امام صاحب کو پیسے دیدے تو اس کا امام صاحب پر یہ احسان ہے۔ اور اس احسان نے اس کو یہ حق دے دیا کہ وہ جب چاہے امام صاحب سے جس طرح بات کرے یا ان کی جانب جس طرح سے چاہے دیکھے۔

اب اگر ہم ان کاموں کو علم معاشیات کے نظریے سے دیکھیں تو دو الگ الگ کام ہیں جو امام صاحب کو کرنا ہوتے ہیں۔ ایک کام ہے اوپر ذکر کیے گئے تمام کاموں کے لیے پیسے اکٹھا کرنا یعنی فنڈ کا انتظام کرنا۔ اور دوسرا کام ہے ان کا حساب وکتاب رکھنا یا رکھوانا، لوگوں کو حساب دینا اور ریکارڈ اور کاغذات تیار کرنا۔ آپ دیکھ لیجیے کسی بھی ملک میں ٹیکس اور

ریونیو (آمدنی) کو اکٹھا کرنے والے لوگ الگ ہوتے ہیں۔ اور ان کا حساب وکتاب رکھنے والے لوگ الگ ہوتے ہیں جو دفتروں میں کام کرتے ہیں۔ فنڈ یا ٹیکس اکٹھا کرنا فیلڈ کا کام ہے اور اس کو درج کرنا، کاغذات تیار کرنا اور حساب وکتاب رکھنا دفتر کا کام ہے۔ ٹیکس اکٹھا کرنے والوں کو الگ سے تنخواہ دی جاتی ہے اور اس کا حساب وکتاب رکھنے والوں کو الگ سے تنخواہ دی جاتی ہے۔ ہم لوگ امام صاحب سے یہ دونوں قسم کے کام لیتے ہیں اور اس کے بدلے میں ہم انہیں کوئی معاوضہ یا اجرت نہیں دیتے۔

یہی نہیں بلکہ محلے، بستی یا گاؤں کے تمام بچوں کو علم دین سکھانا بھی مسجد کے امام کی ذمہ داری ہے۔ ان بچوں کی تعداد پچاس ہو یا سو ہو یا دو سو ہو یا اس سے بھی زیادہ ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور ان تمام بچوں کو ایک مرتبہ صبح میں پڑھانا ہے اور ایک مرتبہ شام میں پڑھانا ہے۔ صبح میں عربی کے قاعدے اور قرآن کی تعلیم دینا اور شام میں اردو کے قاعدوں اور کتابوں کے علاوہ ان کو اردو نقل واملا کی تعلیم دینا ہے۔

ہمیں اس بات کو سمجھنا ہوگا کہ امامت ایک الگ ذمہ داری اور کام ہے اور تدریس یا بچوں کو تعلیم دینا یہ ایک الگ ذمہ داری ہے جو ایک معلم یا مدرس یا استاذ کا کام ہے۔ اس کے لیے مدرس کی شکل میں ایک الگ ملازم کی ضرورت ہے۔ لیکن ہم یہ کام بھی امام سے ہی لے لیتے ہیں جس کے لیے ہم الگ سے اسے ایک روپیہ بھی نہیں دیتے۔

اس کے علاوہ ہمیں ایک اور بات کو سمجھنا ہوگا اور وہ یہ کہ اگر امام صاحب یہ تعلیم مسجد ہی میں دیتے ہیں تب تو خیر ہے۔ اور اگر مدرسہ کی عمارت الگ ہے تو پھر وہ مدرسے میں صرف ایک مدرس کی حیثیت سے محض تعلیم کا ہی کام انجام نہیں دیتے بلکہ کاموں کی ایک لمبی فہرست ہے جو ان کے ذمے آجاتی ہے۔ مدرسے سے متعلق ذمہ داریوں میں جو چیزیں ان کی ذمہ داری میں آتی ہیں ان میں سے کچھ اس طرح ہیں: مدرسے کی عمارت کی

صفائی اور اس کی دیکھ ریکھ، اس کے لیے فنڈ اکٹھا کرنا، اس کی مرمت، اس کی توسیع یعنی اس کی زمین بڑھانا، اس میں کمرے بڑھانا، اس کی عمارت کو پہلے سے زیادہ خوبصورت اور بہتر بنانے کی فکر کرتے رہنا، مدرسے کی تعلیم کے لیول (Level) کو اور آگے لے کے جانا، جیسے اس میں درس نظامی کی شروعات کرنا، پھر درجے بڑھانا وغیرہ۔ اور آج کے زمانے میں مدرسے کے لیے بچوں کا انتظام کرنا بھی امام اور مدرس کی خود کی ذمے داری میں آنے لگا ہے۔ کیونکہ اب تو وہ وقت آگیا کہ مدرسے کو اگر چلانا اور جاری رکھنا ہے تو بچوں کو تلاش کر کے لانا ہوگا اور ان کو سمجھا بجھا کر اپنے مدرسے میں داخلہ دلوانا ہوگا۔ اور ایسے حالات کس طرح پیدا ہو گئے کہ طلبہ کو تلاش کر کے لانا ہوگا، اس کی کچھ وجہیں ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

ہم لوگ نہ صرف مسجد کے امام سے ایک کے بجائے پانچ کام لیتے ہیں بلکہ مدرسوں میں تعلیم دینے والے علمائے کرام سے بھی تقریباً اتنے ہی یا اس سے بھی زیادہ کام لیتے ہیں۔ مدرسے میں رہتے ہوئے ایک عالم دین ایک تو تدریس کا کام انجام دیتے ہیں اور یہ کام کتنا مشکل ہے اس کے بارے میں ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں۔ دوسری بات، مدرسے کی رسیدیں پرنٹ کرانا، انہیں لے کر بستی بستی گھومنا، مدرسے کے لیے فنڈ اکٹھا کرنا، اس کا حساب و کتاب رکھنا اور فائلیں اور ریکارڈس بنانا بھی انہیں کا کام ہے۔ تیسری بات، مدرسے اور اس کی عمارت کے تمام حصوں اور گوشوں کی صفائی کا خیال رکھنا بھی انہیں کا کام ہے۔

چوتھی بات، صبح سے لے کر شام تک طلبہ کو کتابوں کا درس دینے کے بعد سے رات کے بارہ بجے تک طلبہ کی نگرانی کرنا کہ کیا وہ مطالعے میں مشغول ہیں یا نہیں اور اس کے علاوہ ان کی دوسری مصروفیات پر نظر رکھنا بھی انہیں کا کام ہے۔ پانچویں بات، مدرسے کی موجودہ عمارت کی دیکھ بھال، پانی اور بجلی سے متعلق چیزوں کو دیکھنا، اگر عمارت، پانی اور بجلی وغیرہ سے متعلق مدرسے کے اندر کسی دقت کا سامنا ہوتا ہے تو اس کو دور کرنا اور ضرورت

پڑنے پر مرمت کروانا، مدرسے کی عمارت کو پہلے سے بہتر اور خوبصورت بنانے کی فکر کرتے رہنا، مدرسے کی توسیع یعنی اس کے کمروں میں اضافہ کرنا اور مدرسے کی زمین کو بڑھانا بھی مدرسے کے عالم دین کا ہی کام ہے۔

اس طرح سے ہم مسجدوں میں اماموں سے اور مدرسوں میں علمائے کرام سے تقریباً پانچ ملازموں کا کام لیتے ہیں۔ اور تنخواہ ہم اماموں یا علمائے کرام کو ایک ملازم کی بھی پوری نہیں دیتے۔ جیسا کہ ہم نے بتایا، اگر مذہب اسلام کی بلند فکر کے نظریے سے دیکھا جائے تو کسی بھی کام کرنے والے کی کم سے کم تنخواہ اکتیس ہزار دو سو پچاس روپے ماہانہ ہونی چاہیے۔ اگرچہ وہ کام کرنے والا فرد ایک بغیر پڑھا لکھا انسان ہی کیوں نہ ہو اور وہ مزدوری ہی کیوں نہ کرتا ہو۔

اگر ہم ایک طرف مذہب اسلام کی اس بلند فکر کو مد نظر رکھیں اور دوسری طرف اس بات کو پیش نظر رکھیں کہ ایک امام یا مدرسے کا عالم دین کم سے کم پانچ ملازموں کا کام کرتا ہے تو امام یا مدرسے کے عالم دین کی ماہانہ تنخواہ تقریباً ایک لاکھ ۵۶ ہزار دو سو پچاس روپے مہینہ بیٹھے گی۔ جب ہم کام ان سے پانچ ملازموں کا لیتے ہیں تو تنخواہ بھی پانچ ملازموں کی دیں۔ اور اگر تنخواہ ایک ملازم کی دیتے ہیں تو کام بھی ایک ملازم کا لیں۔ ہم ایسا کیوں نہیں کرتے؟ کیا یہ انصاف ہے؟

ہم امام یا مدرس عالم دین کو پانچ ملازموں کی نہیں ایک ہی ملازم کی تنخواہ دے دیتے جو اکتیس ہزار دو سو پچاس روپے بنتی ہے۔ کاش ہم اتنا ہی کر لیتے۔ لیکن اگرچہ ہم کام ان سے پانچ ملازموں کا لیتے ہیں تنخواہ ایک ملازم کی بھی نہیں دیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم ان کو ایک ملازم کی تنخواہ کا بھی پانچواں حصہ دیتے ہیں، بلکہ اس سے بھی کم دیتے ہیں۔ کیونکہ ہم ان کو چھ ہزار دیتے ہیں، اور چھ ہزار روپے، اکتیس ہزار روپے کا پورا پانچواں حصہ بھی نہیں بنتے۔

امام یا عالم دین کو تنخواہ نہیں لینی چاہیے؟

کیا امام اور علمائے دین امامت، تدریس، یا دوسرے دینی کاموں کو انجام دینے کے لیے اجرت لے سکتے ہیں؟ یا اسلام اور شریعت کا مطالبہ یہ ہے کہ وہ دینی خدمات کے بدلے میں کوئی اجرت یا پیسہ نہ لیں؟ اس سلسلے میں فقہاء کا ابتدائی طور پر فتویٰ یہی تھا کہ دینی کاموں کو انجام دینے کے لیے اجرت یا پیسہ لینا جائز نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی مسجد میں اذان دیتا ہے یا نماز پڑھاتا ہے یا کوئی مدرسے میں قرآن یا فقہ کی تعلیم دیتا ہے تو اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اجرت لے۔ لیکن بعد کے فقہاء نے جب دیکھا کہ اگر تمام دینی کاموں کے لیے اجرت لینے کو ناجائز رکھا جائے تو اس سے دین کا بڑا نقصان ہو جائے گا۔ لوگ دین کے کاموں سے دور بھاگنے لگیں گے۔ وہ دینی کاموں کے بجائے دنیوی کاموں کو ترجیح دیں گے تو انہوں نے کچھ دینی کاموں کے لیے اجرت لینا جائز قرار دے دیا۔

انہوں نے اذان، امامت، قرآن اور فقہ کی تعلیم دینے کے لیے اجرت لینے کو جائز قرار دے دیا۔ یہاں تک کہ بعض فقہاء نے وعظ و خطابت کے لیے بھی اجرت لینے کو جائز قرار دے دیا۔ لیکن عوام، مقتدی، مسجدوں اور مدرسوں کے ذمہ داران، کمیٹیاں، صدر، متولیان یا کسی اور قسم کے عہدے داروں کی سوچ یا نظریہ یہی ہے کہ دین کے خادم، ائمہ اور علمائے کرام مذہب و ملت کے لیے جب کسی بھی کام کو انجام دیں تو بغیر اجرت کے انجام دیں۔ ان کو معاوضہ یا تنخواہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس بات کو بھی سمجھنا ہوگا کہ ابتدائی طور پر (Originally) فقہائے احناف (متقدمین) نے دینی کاموں کو انجام دینے کے عوض میں اجرت لینے کو ناجائز قرار کیوں دیا

تھا؟ ان کے ناجائز قرار دینے کی وجہ کچھ احادیث کریمہ تھیں جن میں سے کچھ کو ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

عن عبادة بن الصامت، قال : علمت ناسا من أهل الصفة الكتاب والقرآن، فأهدى إلي رجل منهم قوسا، فقلت: ليست بمال، وأرمي عنها في سبيل الله عز وجل. لآتين رسول الله صلى الله عليه وسلم فلأسألنه. فأتيته فقلت: يا رسول الله! رجل أهدى إلي قوسا ممن كنت أعلمه الكتاب والقرآن، وليست بمال، وأرمي عنها في سبيل الله؟ قال: "إن كنت تحب أن تطوق طوقا من نار فاقبلها."(۳۷)

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: میں نے اصحاب صفہ میں سے کچھ لوگوں کو کتاب اور قرآن کی تعلیم دی۔ توان میں سے ایک شخص نے مجھے کمان ہدیہ میں دی۔ میں نے سوچا: یہ مال نہیں ہے اور میں اس سے اللہ کی راہ میں تیر اندازی کا کام لوں گا۔ لیکن میں پھر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جاکر اس کے بارے میں سوال کروں گا۔ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! جن لوگوں کو میں کتاب اور قرآن کی تعلیم دیتا تھا، ان میں سے ایک نے مجھے کمان ہدیے میں دی ہے۔ اور کمان کوئی مال بھی نہیں ہے۔ میں اس سے اللہ کی راہ میں تیر اندازی کروں گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "اگر تم چاہتے ہو کہ تمہیں (قیامت کے دن) آگ کا طوق پہنایا جائے تو اس کو قبول کرلو۔"(ت)

عن أبي بن كعب، قال: علمت رجلا القرآن، فأهدى إلي قوسا، فذكرت ذلك لرسول الله صلى الله عليه وسلم. فقال: "إن أخذتها أخذت

(۳۷) أبو داؤد السجستانی، سنن أبي داؤد (المكتبة العصرية، بيروت) رقم: ۳۴۱۶

قوسا من نار." فرددتها.[۳۸]

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: میں نے ایک شخص کو قرآن کی تعلیم دی۔ اس نے مجھے ایک کمان ہدیے میں دی۔ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا: "اگر تم نے اس کو لے لیا تو تم نے آگ کی کمان لے لی۔" پھر میں نے اسے واپس کر دیا۔ [ت]

ان احادیث میں تعلیم قرآن کے عوض میں کمان لینے کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کے دن آگ کا طوق پہنائے جانے کا سبب اور آگ کی کمان لینے کے برابر قرار دیا۔ اسی وجہ سے فقہاء نے ابتدائی طور پر قرآن کی تعلیم، امامت، اذان، حدیث اور فقہ وغیرہ دیگر علوم دینیہ کی تعلیم اور اسی طرح دین سے متعلق دیگر خدمات انجام دینے کے عوض اجرت لینے کو ناجائز قرار دیا تھا۔ ان احادیث میں جن میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اجرت نہ لینے کا حکم فرمایا ہے، اجرت لینے سے بچنے کا حکم دینے کی ایک معقول وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ آپ کا مقصد یہ ہوگا کہ لوگوں تک مذہب اسلام کی تعلیمات مفت پہنچیں، ان کو اسلام کی تعلیمات کو جاننے کے لیے کچھ خرچ کرنا نہ پڑے۔ کیونکہ خرچ کرنے کی صورت میں وہ مذہب اسلام کی تعلیمات کے قریب نہیں آئیں گے۔ تو اجرت نہ لینے پر زور ڈالنے اور دینی تعلیم کو مفت رکھنے کے پیچھے مقصد یہ ہوگا کہ دین کے احکامات اور اس کی تعلیمات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکیں۔

دینی کاموں کے عوض اجرت نہ لینے پر زور ڈالنے کے پیچھے وجہ یہ نہیں ہو سکتی کہ قرآن وغیرہ کی تعلیم کے عوض میں ملنے والی اجرت میں معاذ اللہ کسی قسم کی کوئی خامی، برائی یا

---

(۳۸) ابن ماجة، سنن ابن ماجة (دار إحياء الكتب العلمية. فيصل عيسى البابي الحلبي: ۱۹۵۲) رقم: ۲۱۵۸

خباثت تھی۔ کیا یہ کوئی غلط یا حرام کام ہے کہ اس سے ہونے والی کمائی میں کوئی خامی، برائی یا خباثت پیدا ہو؟ کیا دینی تعلیم کو عام کرنے سے زیادہ بھی کوئی کام اعلیٰ، مقدس اور پاکیزہ ہو سکتا ہے؟ اور جب یہ کام اعلیٰ، مقدس اور پاکیزہ ہے تو اس کی کمائی میں خامی، برائی یا خباثت کہاں سے آسکتی ہے؟ تو بنیادی طور پر کمائی اور اجرت حلال اور پاکیزہ ہی تھی۔ اجرت نہ لینے پر زور دینا تعلیم کو مفت رکھنے اور اس کے فیض کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے تھا۔

ہمارا یہ نظریہ کہ قرآن (یا دیگر دینی علوم) کی تعلیم کے عوض ملنے والی اجرت بنیادی طور پر حلال اور پاکیزہ ہے، اس کی تائید بخاری شریف کی مندرجہ ذیل حدیث پاک سے بھی ہوتی ہے۔

عن ابن عباس: أن نفرا من أصحاب النبی ﷺ مروا بماء فیهم لدیغ أو سلیم، فعرض لهم رجل من أهل الماء، فقال: هل فیکم من راق؟ إن فی الماء رجلا لدیغا أو سلیما. فانطلق رجل منهم، فقرأ بفاتحة الکتاب علی شاء، فبرئ، فجاء بالشاء إلی أصحابه، فکرهوا ذالک وقالوا: أخذت علی کتاب الله أجرا؟ حتی قدمو المدینة، فقالوا: یا رسول الله! أخذ علی کتاب الله أجرا. فقال رسول الله ﷺ: "إن أحق ما أخذتم علیه أجرا کتاب الله."[۳۹]

---

(۳۹) محمد بن إسماعیل البخاری، صحیح البخاري (دار طوق النجاة، بیروت: ۱۴۱۱ھ) رقم: ۵۷۳۷

احناف میں سے متقدمین نے اگرچہ دینی علوم کی تعلیم اور دیگر دینی خدمات پر اجرت لینے کو ناجائز قرار دیا تھا لیکن رقیہ (جھاڑ پھونک) پر اجرت لینے کو انہوں نے استثناءً حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی اس حدیث کی بنیاد پر جائز قرار دیا تھا۔ جب کہ بعض فقہاء غیر احناف نے اس حدیث کو رقیہ کے ساتھ ساتھ دینی علوم کی تعلیم اور دیگر دینی خدمات پر اجرت لینے کے جواز کی بھی دلیل بنایا ہے۔ ہمارا یہاں اس حدیث کو پیش کرنے سے مقصد اس کو دینی خدمات کو اجرت کے عوض انجام دینے کے جواز کی دلیل بنانا نہیں ہے۔ بلکہ صرف

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: کچھ صحابہ کرام ایک پانی کے پاس سے گذرے۔ وہاں ایک شخص کو بچھو نے کاٹ لیا تھا۔ (راوی کو شبہ ہے کہ روایت میں لدیغ کا لفظ استعمال ہوا تھا یا سلیم کا) پانی والے لوگوں میں سے ایک شخص آیا اور صحابہ کرام سے دریافت کیا: کیا تم میں کوئی دم کرنے والا ہے؟ ہمارے یہاں ایک شخص کو بچھو نے کاٹ لیا ہے۔ ایک صحابی اس کے ساتھ چلے گئے اور کچھ بکریاں لینے کی شرط پر سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کر دیا۔ وہ شخص ٹھیک ہو گیا۔ وہ صحابی بکریاں اپنے ساتھیوں کے پاس لے آئے۔ باقی ساتھیوں نے اسے پسند نہیں کیا اور کہا کہ تم نے اللہ کی کتاب پر اجرت لے لی؟ یہاں تک کہ وہ مدینہ آ گئے۔ انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اس شخص نے اللہ کی کتاب پر اجرت لی ہے۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جن چیزوں پر تم اجرت لیتے ہو ان میں اجرت کی سب سے زیادہ حقدار اللہ کی کتاب ہے۔''(ت)

اس حدیث پاک کے مطابق اگر کسی نے قرآن کے ذریعے سے کسی بیماری یا دکھ درد کی جھاڑ پھونک کی تو اس پر اجرت لینا کوئی غلط کام نہیں بلکہ قرآن ایک ایسی مہتم بالشان چیز ہے کہ قرآن کے ذریعے جھاڑ پھونک پر اجرت لینے کا حق باقی تمام چیزوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہے۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ قرآن کے ذریعے سے ملنے والی اجرت بنیادی طور پر حلال اور پاکیزہ ہے۔ کیونکہ اگر وہ بنیادی طور پر حلال اور پاکیزہ نہ ہوتی تو قرآن کے ذریعے جھاڑ پھونک کے عوض میں بھی حلال نہ ہوتی۔

اب اگر قرآن کے ذریعے سے ملنے والی اجرت بنیادی طور پر حلال اور پاکیزہ ہے

یہ دکھانا ہے کہ قرآن کی تعلیم (اور دیگر دینی خدمات) کے عوض میں ملنے والی اجرت بنیادی اور اصولی طور پر حلال اور پاکیزہ ہے۔ ہاں کچھ دوسرے اسباب (علل) ایسے پیدا ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے ان کے عوض اجرت کا لینا ناجائز قرار پائے۔

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں اور جس وقت اجرت لینے کو منع کیا گیا ہے وہ کسی سبب (علت) کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔ تو جہاں اور جس وقت وہ سبب پایا جائے گا وہاں اور اس وقت قرآن کے ذریعے سے ملنے والی اجرت کا لینا ناجائز ہوگا اور جہاں اور جس وقت وہ سبب نہیں پایا جائے گا وہاں اور اس وقت اس اجرت کا لینا جائز ہوگا۔

جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں، زمانۂ نبوی میں قرآن کی تعلیم پر اجرت لینے سے منع کیے جانے کا سبب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ قرآن کی تعلیم زیادہ سے زیادہ عام ہو۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے زمانے میں تعلیم کو مفت رکھنے میں ٹھیک اس کے الٹے نتیجے آرہے ہیں۔ چونکہ تعلیم کو مفت رکھنے کی وجہ سے، اور اسی طرح اور دینی کاموں کو مفت رکھنے کی وجہ سے دین کی تعلیم دینے والوں، اماموں، علما، مفتیان کرام اور دوسرے دینی کاموں کو انجام دینے والے افراد کو اجرت نہیں ملتی یا اتنی کم اجرت ملتی ہے کہ مزدور لوگ جن کے پاس نہ تعلیم ہوتی ہے اور نہ تربیت، ان کو بھی اماموں، علمائے دین اور دین کے خادموں سے زیادہ معاوضہ ملتا ہے، اس لیے نئی نسل نے دینی کاموں کو چھوڑ کر دنیوی کام اختیار کرنا شروع کر دیے۔ اور دینی تعلیم کو چھوڑ کر دنیوی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دیا۔

یہ انہوں نے اس وجہ سے نہیں کیا کہ معاذ اللہ ان کا ایمان کمزور ہو گیا، یا انہیں دین اور ایمان کی فکر نہ رہی۔ یہ انہوں نے اس وجہ سے کیا تاکہ وہ اپنے مستقبل کو اور اپنی زندگی کو غربت، فاقہ کشی اور طرح طرح کی مشکلات سے محفوظ رکھ سکیں۔ ہاں جب وہ دین کی تعلیم نہ حاصل کر سکے تو پھر وقت کے ساتھ ان کا ایمان بھی کمزور ہو گیا اور انہیں اپنے دین اور ایمان کی فکر بھی نہ رہی۔ یہی نہیں علما اور دین کے خادموں کو اجرت کے نہ ملنے یا مایوس کن حد تک کم ملنے کی وجہ سے اس کے علاوہ اور بھی بہت سے دین کے نقصانات ہوئے جن کو ہم کتاب کے شروع میں بیان کر چکے ہیں۔

اس طرح مفت تعلیم دینے کا اور دین کے دوسرے کاموں کو مفت انجام دینے کی طرف رغبت دلانے کا جو اصل مقصد تھا وہ ہمارے زمانے میں فوت ہو گیا۔ ہمارے زمانے میں دینی تعلیم اور دین کے دوسرے کاموں کو مفت رکھنے یا ان کے عوض میں معمولی اجرت دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دین کم سے کم لوگوں تک پہنچنے لگا۔ کیونکہ والدین کو اپنے بچوں کو دین کی تعلیم دلوانے میں یا دین کا خادم بنانے میں ان کا مستقبل غیر محفوظ نظر آتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دین کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کا بچہ یا تو مسجد کا امام بنے گا یا مدرسے کا مدرس یا اسی طرح کا کوئی اور کام کرے گا اور ان میں سے کسی بھی کام کو کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کا بچہ غربت اور تنگ حالی کی زندگی گزارنے کے لیے مجبور ہو جائے گا۔ اس طرح مدرسوں میں طلبہ کی تعداد بھی مایوس کن حد تک کم ہوگئی اور ساتھ ہی قابل ائمہ، علما اور اساتذہ کی بھی قلت پیدا ہوگئی۔ مجموعی طور پر علم دین کا رجحان اتنا کم ہو گیا کہ پانچ فیصد مسلمان بھی ایسے نہیں ہیں جو مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اور علم دین کا ہی رجحان کم ہو جائے دین کا اس سے زیادہ نقصان اور کیا ہو سکتا ہے؟

ہمارے زمانے میں دین اور دینی تعلیم کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کا ایک یہی کامیاب طریقہ نظر آتا ہے کہ علمائے دین، مدرسوں، اماموں، مفتیان کرام اور دین کے دوسرے کام انجام دینے والوں کی اجرت کو نہ صرف معقول بنایا جائے بلکہ دنیوی کاموں کے مقابلے میں دینی کاموں کی اجرت زیادہ ہو۔ اگر ہم دینی کاموں کو انجام دینے والوں سے مفت میں کام لینے کی کوشش کو جاری رکھیں گے تو ہمارے سماج سے دین کے اٹھ جانے میں کوئی زیادہ وقت نہیں لگے گا۔

تو پہلے جس سبب سے علم دین یا دین سے متعلق دیگر خدمات پر اجرت لینے کو منع کیا گیا تھا ہمارے زمانے میں وہ سبب ختم ہو گیا۔ اسی لیے فقہائے متاخرین اور ہمارے زمانے

کے علماے کرام نے اجرت لینے کو جائز قرار دے دیا۔

تنویر الابصار اور الدر المختار میں ہے:

(لاتصح الإجارة)........لأجل الطاعات مثل (الأذان والحج والإمامة وتعليم القرآن والفقه) ويفتى اليوم بصحتها لتعليم القرآن والفقه والإمامة والأذان۔[40]

طاعات جیسے اذان، حج، امامت، اور قرآن وفقہ کی تعلیم پر اجرت لینا جائز نہیں ہے۔ لیکن آج کے زمانے میں فقہاء قرآن وفقہ کی تعلیم دینے، امامت اور اذان پر اجرت لینے کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں۔ (ت)

علامہ شامی و يفتى اليوم بصحتها لتعليم القرآن... کے تحت فرماتے ہیں:

قال في الهداية: وبعض مشائخنا ـ رحمهم الله تعالى ـ استحسنوا الاستئجار على تعليم القرآن اليوم لظهور التواني في الأمور الدينية، ففي الامتناع تضييع حفظ القرآن وعليه الفتوى اهـ. وقد اقتصر على استثناء تعليم القرآن أيضا في متن الكنز ومتن مواهب الرحمن وكثير من الكتب. وزاد في مختصر الوقاية ومتن الإصلاح تعليم الفقه، وزاد في متن المجمع الإمامة، ومثله في متن الملتقى ودرر البحار. وزاد بعضهم الأذان والإقامة والوعظ.[41]

صاحب ہدایہ نے فرمایا: اور آج کے زمانے میں ہمارے بعض مشائخ رحمہم اللہ تعالیٰ نے دینی معاملات میں سستی پیدا ہوجانے کی وجہ سے قرآن کی تعلیم دینے پر اجرت

(۴۰)الدر المختار مع رد المحتار (دار الفکر، بیروت: ۱۹۹۲) ج:۶، ص:۵۵

(۴۱)أيضا

لینے کو استحساناً جائز قرار دیا ہے۔ کیونکہ اجرت لینے کو منع کرنے میں حفظ قرآن کا ضائع ہونا لازم آئے گا۔ اور اسی پر فتویٰ ہے۔ اھ۔ کنز کے متن اور مواہب الرحمٰن کے متن اور دیگر کثیر کتابوں میں صرف قرآن کی تعلیم دینے کو عدم جواز سے الگ کیا ہے۔ اور مختصر الوقایہ اور اصلاح کے متن میں فقہ کی تعلیم کا بھی اضافہ کیا ہے۔ اور مجمع کے متن میں امامت کا بھی اضافہ کیا ہے۔ اور اسی طرح ملتقیٰ کے متن اور درر البحار میں ہے۔ اور بعض نے اذان، اقامت اور وعظ کا بھی اضافہ کیا ہے۔ (ت)

تاہم ہمارے زمانے میں بھی عبادات اور طاعات میں کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں کہ اگر ان کے عوض میں اجرت نہ بھی لی جائے تب بھی دین کا کوئی نقصان نہ ہوگا۔ مثال کے طور پر قرآن خوانی وغیرہ۔ اسی لیے قرآن خوانی وغیرہ پر اجرت لینے کو ہمارے زمانے میں بھی جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

هذا دليل قاطع وبرهان ساطع على أن المفتى به ليس هو جواز الاستئجار على كل طاعة بل على ما ذكروه فقط مما فيه ضرورة ظاهرة تبيح الخروج عن أصل المذهب من طرو المنع... فظهر لك بهذا عدم صحة ما في الجوهرة من قوله: "واختلفوا في الاستئجار على قراءة القرآن مدة معلومة. قال بعضهم: لا يجوز: وقال بعضهم: يجوز وهو المختار."اه

والصواب أن يقال: "على تعليم القرآن"، فإن الخلاف فيه كما علمت لا في القراءة المجردة فإنه لا ضرورة فيها، فإن كان ما في الجوهرة سبق قلم فلا كلام، وإن كان عن عمد فهو مخالف لكلامهم قاطبة فلا يقبل.[۴۲]

---

(۴۲) أيضًا

یہ (بات کہ فقہاء نے قرآن کی تعلیم وغیرہ پر اجرت کو دینی معاملات میں سستی پیدا ہونے کی وجہ سے جائز قرار دیا ہے) اس بات کی قاطع دلیل اور روشن برہان ہے کہ اجرت لینا تمام طاعت کے کاموں میں جائز نہیں ہے بلکہ صرف ان کاموں میں جائز ہے جن میں (اجرت لینے کو جائز قرار دینے کی) ضرورت ہے۔ یہ ضرورت ان کاموں کو اصل مذہب یعنی عدم جواز سے نکال دیتی ہے۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ جوہرہ میں جو یہ کہا گیا ہے: "وقت معین تک کسی دوسرے کے لیے تلاوت قرآن پر اجرت لینے کے بارے میں اختلاف ہے، بعض نے کہا ہے جائز ہے اور بعض نے کہا ہے جائز نہیں ہے، اور یہی قول مختار ہے۔" درست نہیں ہے۔

درست یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ "قرآن کی تعلیم پر اجرت لینے کے بارے میں اختلاف ہے۔" کیونکہ اختلاف تعلیم کے بارے میں ہے نہ کہ تلاوت کے بارے میں، کیونکہ تلاوت میں ضرورت نہیں ہے۔ تو جو جوہرہ میں لکھا ہے اگر وہ قلم کی لغزش ہے تب تو کوئی بات نہیں۔ اور اگر عمداً ایسا لکھا گیا ہے تو پھر یہ تمام فقہاء کے موقف کے خلاف ہے اور اس لیے قابل قبول بھی نہیں ہے۔ (ت)

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے آج کے زمانے کے لیے فقہاء کا فتویٰ یہی ہے کہ ائمہ، علما اور مفتیان کرام کے لیے اپنے کاموں پر اجرت لینا جائز ہے۔ اور اگر جائز ہے تو ان کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا جائے جیسے ان کے لیے اجرت لینا حرام ہو؟ کیوں نہ انہیں ان کے کاموں کی معقول اجرت دی جائے؟ کیوں نہ ان کو اتنا معاوضہ دیا جائے کہ دین دوبارہ سے توانا اور طاقتور ہو جائے؟ کیوں نہ ان کو ان کے کاموں کی اتنی قیمت دی جائے اور اتنی قدر کی جائے کہ لوگ دنیا کے مقابلے میں دین کے کاموں کو کرنا زیادہ پسند کریں؟

تنخواہ لینے والے کو ثواب نہیں ملتا؟

اگر کوئی عالم دین کسی قسم کا کوئی دینی کام کرتا ہے، امامت کرتا ہے یا مدرسے میں دین کی تعلیم دیتا ہے اور ان کاموں کے عوض میں وہ اجرت لیتا ہے، یا کتابیں لکھتا ہے اور کتابوں کی وجہ سے جو آمدنی ہوتی ہے اس کو اپنے پاس رکھتا ہے، یا کسی اور طرح سے دین کی خدمت انجام دیتا ہے اور بدلے میں اجرت یا تنخواہ لیتا ہے تو کیا اس اجرت، آمدنی یا تنخواہ لینے کی وجہ سے، ان دینی کاموں پر اسے ثواب نہیں ملے گا؟ یعنی کیا ایسا ہے کہ اگر وہ اپنی طرف سے کیے جانے والے دینی کاموں کے بدلے میں اجرت لیتا ہے تو اس کو آخرت میں ثواب نہیں ملے گا؟ اور اگر وہ آخرت میں ثواب حاصل کرنا چاہتا ہے تو پھر دنیا میں اجرت نہ لے؟ اس سلسلے میں علمائے کرام کا ایک موقف یہی ہے کہ کوئی بھی فرد جس نے کوئی دین کا کام کیا اور اس کے عوض میں اس نے اجرت لی تو اس کو آخرت میں ثواب نہیں ملے گا۔ اگر وہ آخرت میں ثواب کا حقدار بننا چاہتا ہے تو وہ اپنے دینی کام کے عوض میں اجرت نہ لے۔

ہاں اگر صورتحال ایسی ہے کہ اگر وہ اجرت نہ لے تو اپنے گھر کے اخراجات کے لیے اور اپنے بیوی بچوں اور والدین کی دیکھ بھال کے لیے اس کے پاس کوئی ذرائع نہ ہوں گے تو اس صورت میں اجرت لینے کے باوجود بھی وہ آخرت میں ثواب کا حقدار ہوگا۔ یہ حکم اس وجہ سے ہے کہ اسے اجرت لینے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کی نیت میں یہ بات ہونی چاہیے کہ اگر اسے ضرورت نہ ہوتی تو وہ اجرت نہ لیتا۔

ردالمحتار میں ہے:

نعم قد يقال: إن كان قصده وجه الله تعالىٰ لكنه بمراعاته للأوقات

والاشتغال به يقل اكتسابه عما يكفيه لنفسه وعياله. فيأخذ الأجرة لئلا يمنعه الاكتساب عن إقامة هذه الوظيفة الشريفة، ولولاذلک لم يأخذ أجرا فله الثواب المذكور. بل يكون جمع بين عبادتين: وهماالأذان، والسعى على العيال. وإنما الأعمال بالنيات.(۴۳)

فقہا یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر قصد اللہ رب العزت کی رضا کا ہو لیکن اذان دینے کے کام میں لگنے کی وجہ سے اس کی کمائی اتنی کم ہوجائے گی کہ وہ اس کے اور اس کے اہل وعیال کے لیے کافی نہ ہوگی اور وہ اجرت اس وجہ سے لیتا ہے کہ اگر وہ کمائی کے لیے کوئی دوسرا کام کرے گا تو اذان دینے کی اس مقدس ذمے داری کو وہ انجام نہیں دے پائے گا اور اگر اسے ضرورت نہ ہوتی تو اجرت نہ لیتا، تو اس کو ثواب ملے گا۔ بلکہ اس کے حق میں دو عبادتوں کا ثواب لکھا جائے گا۔ ایک اذان کا اور دوسرا اپنے اہل وعیال کی دیکھ بھال کا۔ اور اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔(ت)

لیکن اس سلسلے میں ہم اپنی سعی میں جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک دین کا کام یا خدمت انجام دینے والا انسان اپنے دینی کام یا خدمت کے عوض میں اگر اجرت بھی لے وہ تب بھی آخرت میں ثواب کا حقدار ہوگا، بشرطیکہ اس کا مقصد دین کی خدمت ہو۔ دراصل وہ اجرت یا پیسے تو کسی دنیوی کام کو کر کے بھی کما سکتا تھا۔ دنیا میں ہزاروں ایسے دنیوی کام ہیں جن کے ذریعے وہ پیسے کما سکتا تھا۔ بلکہ اگر آج کے حالات کو نگاہ میں رکھ کر بات کی جائے تو وہ اگر دینی کاموں کو ترک کر کے اتنی محنت کسی دنیوی کام میں کرے اور اتنا وقت کسی دنیوی کام کو دے تو دینی کام کے مقابلے کئی گنا زیادہ پیسے کمائے گا۔

اس کے باوجود اس کا دنیوی کام پر دینی کام کو ترجیح دینا اس بات کی دلیل ہے کہ اس

(۴۳) الدر المختار مع رد المحتار (دار الفکر، بیروت: ۱۹۹۲) ج:۱، ص:۳۹۲

کا اصل مقصد دین کا کام کرنا ہی ہے۔اس کا اصل مقصد دین کو فروغ دینا،اس کی خدمت کرنا،اس کی تعلیمات کو پھیلانا،لوگوں کو دین سکھانا اور لوگوں کی دینی تربیت کرنا ہی ہے۔اس وجہ سے اس کو اس کی نیک نیت کی بنیاد پر آخرت میں ثواب ملے گا۔اس طرح وہ اجرت کا بھی حقدار ہے اور ثواب کا بھی حقدار ہے۔

ایک طرف درج ذیل حدیث پاک اس بات کو واضح کرتی ہے کہ اگر کوئی فرد کسی قسم کا دینی کام کرتا ہے اور اس کا مقصد اس سے دینی کام نہیں ہے بلکہ دنیا ہے تو وہ فرد ثواب کا حقدار نہیں ہوگا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الأعمال بالنية، ولكل امرئ ما نوى. فمن كانت هجرته إلى الله ورسوله فهجرته إلى الله ورسوله. ومن كانت هجرته لدنيا يصيبها، أو امرأة يتزوجها فهجرته إلى ما هاجر إليه .(۴۴)

اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔کسی بھی انسان کے لیے اصل وہ ہے جس کی اس نے نیت کی۔جس کا مقصد اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کرنا ہو تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہوگی۔اور جس کا مقصد ہجرت سے دنیا حاصل کرنا یا کسی عورت سے نکاح کرنا ہو تو اس کی ہجرت انہیں مقاصد کے لیے مانی جائے گی۔(ت)

ہم اس حدیث پاک میں دیکھ سکتے ہیں کہ وہ ہجرت جس کی یہاں بات ہو رہی ہے وہ بنیادی طور پر ایک دینی ہجرت تھی لیکن پھر بھی ایک ہجرت کرنے والا ثواب کا حقدار ہے اور دوسرا نہیں۔ہجرت اس فرد نے بھی کی جس کا مقصد اللہ ورسول عزوجل وصلی اللہ علیہ

(۴۴)محمد بن إسماعيل البخاري، صحيح البخاري (دار طوق النجاة،بیروت:۱۴۱۱ھ) رقم:۵۴

وسلم کی طرف ہجرت کرنا تھا اور ہجرت اس فرد نے بھی کی جس کا مقصد کسی عورت سے نکاح کرنا یا دنیا کو حاصل کرنا تھا۔ کام دونوں نے ایک ہی کیا اس کے باوجود ان میں سے پہلا فرد اجر وثواب کا حقدار ہوگا اور دوسرا فرد اجر وثواب کا حقدار نہیں ہوگا۔ اس فرق کے پیچھے وجہ ان دونوں کی نیت اور مقصد میں فرق ہے۔ پہلے فرد کا مقصود اللہ ورسول عزوجل وصلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور دوسرے فرد کا مقصود کسی عورت سے نکاح یا دنیا ہے۔

دوسری طرف مندرجہ ذیل احادیث کریمہ اس بات کو بھی واضح کرتی ہیں کہ وہ لوگ جو دنیا کا کام کرتے ہیں لیکن ان کی نیت میں نیکی اور رضائے الٰہی ہے تو وہ اس دنیا کے کام کرنے کی وجہ سے بھی آخرت میں ثواب کے حقدار ہوں گے۔

حضرت سیِّدُنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، آپ فرماتے ہیں:

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يعودني عام حجة الوداع من وجع اشتد بي، فقلت: إني قد بلغ بي من الوجع، وأنا ذو مال ولا يرثني إلا ابنة، أفأتصدق بثلثي مالي؟ قال : "لا". فقلت: بالشطر؟ فقال: "لا". ثم قال: "الثلث والثلث كبير ـ أو كثير ـ إنك أن تذر ورثتك أغنياء خير من أن تذرهم عالة يتكففون الناس، وإنك لن تنفق نفقة تبتغي بها وجه الله إلا أجرت بها، حتى ما تجعل في في امرأتك".[45]

حجۃ الوداع کے سال میں بہت تکلیف میں تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کے لیے تشریف لاتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے عرض کیا: میں درد کا شکار ہوگیا ہوں۔ اور میں ایک مالدار شخص ہوں، میرے وارثوں میں صرف ایک بیٹی ہے تو کیا میں

---

(۴۵) محمد بن إسماعيل البخاري، صحيح البخاري (دار طوق النجاة، بيروت: ۱۴۱۱ھ) رقم: ۱۲۹۵

اپنے مال کے دو تہائی حصے صدقہ کردوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نہیں"۔ میں نے عرض کیا: پھر آدھا صدقہ کردوں؟ آپ نے فرمایا: "نہیں"۔ پھر فرمایا: "ایک تہائی صدقہ کردو، ایک تہائی بہت ہے۔ تم اپنے وارثوں کو مسکینی کی حالت میں چھوڑ کر جاؤ اس طرح کہ وہ دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھریں، اس سے بہتر یہ ہے کہ تم انہیں مالدار چھوڑ کر جاؤ۔ تم اللہ کی رضا کی نیت سے جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو، اس پر تمہیں ثواب ملتا ہے، یہاں تک کہ اس لقمے پر بھی ثواب ملتا ہے جو تم اپنے ہاتھ سے اپنی بیوی کو کھلاتے ہو۔ (ت)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ما أطعمت نفسك فهو لك صدقة،وما أطعمت ولدك فهو لك صدقة، وما أطعمت زوجتك فهو لك صدقة، وما أطعمت خادمك فهو لك صدقة۔[۴۶]

تم جو کچھ اپنے آپ کو کھلاتے ہو وہ تمھارے لئے صدقہ ہے۔ جو اپنی اولاد کو کھلاتے ہو وہ بھی صدقہ ہے۔ جو اپنی بیوی کو کھلاتے ہو وہ بھی صدقہ ہے اور جو اپنے خادم کو کھلاتے ہو وہ بھی صدقہ ہے۔ (ت)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من أنفق على نفسه نفقة يستعف بها فهي صدقة، ومن أنفق على امرأته وولده وأهل بيته فهي صدقة۔[۴۷]

جس نے خود پر اس لئے خرچ کیا تاکہ خود کو دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے سے بچائے تو یہ صدقہ ہے اور جس نے اپنے بیوی بچوں اور گھر والوں پر خرچ کیا تو یہ بھی

(۴۶) أحمد بن حنبل، مسند الإمام أحمد بن حنبل (مؤسسة الرسالہ: ۲۰۰۱ء) رقم: ۱۷۱۷۹

(۴۷) أبو القاسم الطبرانی، المعجم الأوسط (دار الحرمين، قاهرة: ۱۴۱۵ھ) رقم: ۳۸۹۷

صدقہ ہے۔ (ت)

اپنا مال دوسرے لوگوں کو صدقے میں دینے کے بجائے خود کو کھلانا، اپنے بچوں کو کھلانا، بیوی کو کھلانا، خادم کو کھلانا اور اپنے گھر والوں کو کھلانا یا ان پر خرچ کرنا یہ سب دنیوی کام ہیں۔ اس کے باوجود بھی اگر ان دنیوی کاموں کو کرنے کے پیچھے نیت نیک ہو مثلاً اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا مقصود ہو یا دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے سے بچنا مقصود ہو تو ثواب ملے گا۔

قاعدہ یہ سمجھ میں آیا کہ اگر جائز دنیوی کام کو بھی نیک نیت سے کیا جائے تو بندہ اس پر ثواب کا حقدار ہوگا اور اگر دینی کام کو بھی نیک نیت سے نہ کیا جائے تو اس پر ثواب کا حقدار نہ ہوگا۔ نیت اصل ہے۔ تو کوئی امام یا عالم دین کسی دینی کام کے عوض یا دین کی خدمت کے عوض اجرت لیتا ہے اور اس کا مقصد دین کو فروغ دینا ہے، اس کی نیت نیک ہے تو وہ آخرت میں ثواب کا حقدار ہوگا اگرچہ وہ اجرت لیتا ہو۔ یعنی اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اس کے اجرت لینے کی وجہ سے اس کا دینی کام ایک دنیوی کام ہو گیا، دینی کام نہ رہا تب بھی اس کو اس کی نیک نیت کی وجہ سے ثواب ملے گا۔ کیونکہ دنیوی کام میں بھی اگر نیت نیک ہو تو بندہ ثواب کا حقدار ہوگا۔

ہاں اگر کوئی امام یا عالم دین اپنی طرف سے کیے جانے والے دینی کام یا خدمت دین کے عوض اجرت نہ لے تو اس کو دوہرا ثواب ملے گا۔ ایک تو اس بات کا کہ اس کا مقصد دین کو فروغ دینا ہے اور دوسرا اس بات کا کہ وہ دینی خدمات لوگوں کو مفت مہیا کرا رہا ہے۔

یہ کچھ اس طرح ہے جیسے کسی متبحر مجتہد فقیہ نے کسی مسئلے کا شرعی حکم جاننے کے لیے اجتہاد کیا تو اگر وہ درست نتیجے تک پہنچ گیا تو اس کے لیے دوگنا ثواب ہے اور اگر درست نتیجے تک نہیں پہنچ پایا تب بھی اس کے لیے ایک گنا ثواب ہے۔ ایسا اس وجہ سے ہے کہ

اگرچہ وہ درست نتیجے تک نہیں پہنچا لیکن اس کی نیت میں ایک نیک کام کو انجام دینا تھا اور وہ تھا ایک نئے مسئلے کا شرعی حکم جاننا۔ تو اگرچہ بالآخر اس سے خطا ہو گئی لیکن پھر بھی وہ اپنی نیک نیتی کی وجہ سے ثواب کا حقدار ہو گیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إذا حكم الحاكم فاجتهد فأصاب فله أجران، وإذا حكم فاجتهد فأخطأ فله اجر۔(۴۸)

اگر کسی (فقیہ) حاکم نے فیصلہ کرنے سے پہلے اجتہاد کیا اور وہ درست نتیجے پر پہنچا تو اس کے لیے دوگنا اجر ہے اور اگر اس نے فیصلہ کرنے سے پہلے اجتہاد کیا لیکن اس سے خطا ہو گئی تو اس کے لیے ایک گنا اجر پھر بھی ہے۔(ت)(۴۹)

---

(۴۸) أبو داؤد، سنن أبو داؤد (المكتبة العصرية، بيروت) رقم: ۳۵۷۴

(۴۹) ہمارا مقصد یہاں اس بات کے تفصیلی دلائل پیش کرنا نہیں ہے کہ امام اور عالم دین اپنے دینی کام یا خدمت دین کے عوض میں اگرچہ اجرت لیں، ثواب کے حقدار ہوں گے۔ مقصد اس حد تک اس بات کو واضح کرنا ہے کہ ذہن اور دماغ کو اس مسئلے کے بارے میں ایک اطمینان حاصل ہو جائے۔ اس لیے ہم نے یہاں محض اتنی احادیث کے ذکر پر اکتفا کیا کہ جن سے وضاحت مسئلہ اور اطمینان قلب کا مقصد حاصل ہو جائے۔ تفصیلی دلائل اور تحقیق کے لیے یہ جگہ نہ تو موزوں ہے اور نہ کافی ہے۔

مفتیانِ کرام مزدوروں کی صف میں

جیسا کہ بتایا جاچکا ہے، ایک لمبا عرصہ لگتا ہے اس مقام پر پہنچنے کے لیے جب ایک طالب علم کو "مفتی" کے لقب سے نوازا جاتا ہے۔ پانچ سال لگاتار تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک طالب علم کو "مولوی" کے خطاب سے نوازا جاتا ہے۔ اس کے بعد جب وہ دو سال مزید جد و جہد اور تگ و دو میں خرچ کرتا ہے تو پھر اسے "عالم" کے خطاب کے ساتھ نوازا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد پھر مزید دو سال خرچ کرنے پر "فضیلت" کی ڈگری دی جاتی ہے اور طالب علم کو "فاضل" کہا جاتا ہے۔

ان سارے مرحلوں سے گذرنے کے بعد پھر دو سال اور خرچ کرنا پڑتے ہیں۔

ان دو سال کے دوران ساری توجہ علم فقہ، علم اصول فقہ، متعلقہ علوم اور ان کی دقیق تفصیلات پر لگائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ عملی تجربہ حاصل کرانے کے لیے طالب علم کو ساتھ ساتھ دو سال تک فتویٰ نویسی کی مشق کرائی جاتی ہے۔ جو ایک نہایت دشوار گزار مرحلہ ہوتا ہے۔ تیسری چیز جو بہت اہم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ افتاء کے ہر طالب علم کو فقہی دنیا سے متعلق کسی موضوع پر ایک تفصیلی مقالہ بھی لکھنا ہوتا ہے جو پی ایچ ڈی (PhD) کے مقالے کی طرح ایک عمیق، تخلیقی اور منظم تحقیق پر مبنی ہوتا ہے۔ جد و جہد، جانفشانی، انتہائی مصروفیت اور محنت طلب تربیت و تعلیم کے دو سال سے گزرنے کے بعد ہی ایک طالب علم کو اس قابل قرار دیا جاتا ہے کہ اسے "افتاء" یا "تحقیق فی الفقہ" یا "تخصص فی الفقہ" کی سند یا ڈگری سے نوازا جائے اور طالب علم کو "مفتی" کے لقب سے نوازا جائے۔

اوپر ذکر کی گئی تمام ڈگریوں میں سے ہر اگلی ڈگری اس سے پہلی والی ڈگری سے

زیادہ جد وجہد، محنت و جانفشانی مانگتی ہے۔ اس طرح سے گیارہ سال کا لمبا عرصہ لگتا ہے "مفتی" بننے کے مقام تک پہنچنے کے لیے۔ اور اگر کسی طالب علم نے مولویت کے کورس کو شروع کرنے سے پہلے حفظ قرآن کا شرف بھی حاصل کیا تھا تو ہم اس گیارہ سال میں تین سال کا اضافہ اور کرلیں گے۔ اور حفظ یا مولویت کے ساتھ میں ہی علم تجوید و قراءت حاصل کیا تب تو الگ بات ہے ورنہ دو سال ہم اور بڑھا لیں گے۔ یہ کل ملا کر ۱۶ سال ہو گئے۔

اس طرح جو طالب علم حافظ قرآن بھی ہے اور قاری بھی ہے تو اس کو کم سے کم سولہ سال مفتی کا خطاب حاصل کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ ہاں اگر کسی نے علم تجوید و قراءت کو مولویت کے کورس کے دوران ہی حاصل کرلیا ہے تو وہ اپنے دو سال بچا لیتا ہے۔ لیکن سال ہی بچتے ہیں محنت تو کم نہیں ہو جاتی۔ اور جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بتایا، علم دین کی سب سے پہلی ڈگری یعنی مولویت کا معیار ہی اتنا اونچا ہوتا ہے کہ اس میں داخلہ لینے کے لیے ایک طالب علم کو پہلے سے ہی اردو اور عربی کو نہ صرف روانی سے پڑھنا بلکہ لکھنا اور اچھا املا بھی آنا چاہیے۔ اچھے خاصے سال عربی و اردو پڑھنا اور ان کی نقل و املا سیکھنے میں بھی صرف ہو جاتے ہیں۔ ایک طرح سے جتنا وقت کالج یا یونیورسٹی کے طالب علم کو پی ایچ ڈی (PhD) کی ڈگری حاصل کرنے میں لگتا ہے تقریباً اتنے ہی سال مدرسے کے ایک طالب علم کو مفتی کا خطاب حاصل کرنے میں لگ جاتے ہیں۔

ہم چاہے کسی کمپنی کو دیکھ لیں، سرکار کے مختلف اداروں کو دیکھ لیں، یونیورسٹیوں کو دیکھ لیں یا اس طرح کے کچھ اور نظاموں اور اداروں کو دیکھ لیں ان سب میں ہمیں ایک اصول تو ضرور مل جاتا ہے اور وہ یہ کہ جیسے جیسے قابلیت، تجربہ اور علم بڑھتا چلا جاتا ہے ویسے ویسے متعلقہ کمپنی، سرکاری یا غیر سرکاری ادارے یا یونیورسٹی میں اپنی خدمات دینے والے

فرد کا عہدہ، اس کا منصب اور اس کی اجرت اور تنخواہ بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔

توجس نے آٹھویں کلاس تک تعلیم حاصل کی ہے اس کے مقابلے میں وہ فرد جس نے دسویں تک تعلیم حاصل کی ہے اپنے منصب اور اجرت دونوں میں آگے اور اعلیٰ ہوتا ہے۔ اور جس نے بارہویں تک تعلیم حاصل کی ہے وہ اپنے منصب اور اجرت دونوں کے لحاظ سے اس سے آگے اور اعلیٰ ہوتا ہے جس نے دسویں تک تعلیم حاصل کی ہے۔ پھر جس نے کسی سبجیکٹ (Subject) میں گریجویشن (Graduation) کی ہے اس کا مقام اور بھی بلند ہے۔

اس کے بعد جس نے پوسٹ گریجویشن (Post-graduation) کی، اس کا مقام اور بھی زیادہ بلند ہے۔ اس کے بعد جس نے ایم فل (MPhil) کی ڈگری حاصل کی ہے، اس کا منصب و مرتبہ اور بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ اور اگر کسی نے ایم فل کے بعد پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کرلی ہے تو پھر وہ سب سے آگے اور اپنے مقام و مرتبے میں وہ سب سے بلند ہوتا ہے۔ اور جس کا مقام و مرتبہ جتنا بلند ہوتا ہے اسی حساب سے اس کی اجرت اور تنخواہ بھی طے کی جاتی ہے۔ اس طرح کمپنیوں اور سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں کام کرنے والوں کے عہدے اور ان کی تنخواہیں، ان کی قابلیت اور تجربے کی بنیاد پر طے ہوتی ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ ایک بار ملازمت مل جانے کے بعد پھر ایک ملازم ہمیشہ اسی عہدے اور مقام پر رہتا ہے جس عہدے یا مقام پر اس کی تعیناتی ہوئی تھی یا اس کو اتنی ہی اجرت یا تنخواہ ملتی رہتی ہے جتنی اس کو ملازمت شروع ہونے کے وقت دی گئی تھی۔ بلکہ ملازمت مل جانے کے بعد کسی تنظیم میں، کسی یونیورسٹی میں یا سرکار کے کسی محکمے میں یا کسی کمپنی یا ادارے میں جب کوئی مزید محنت کرتا ہے، اپنے علم اور تجربے کو اور بھی زیادہ بڑھاتا

ہے تو اس کو اس تنظیم، یونیورسٹی، محکمے، کمپنی یا ادارے میں پروموشن (Promotion) ملتی ہے۔ اس کو اس کے چھوٹے عہدے سے بڑے عہدے کی طرف بڑھایا جاتا ہے۔ اس کو ترقی دی جاتی ہے اور اس کی اجرت بھی بڑھائی جاتی ہے۔ تنظیموں، یونیورسٹیوں، محکموں، کمپنیوں یا اداروں میں یہ کچھ ایسی چیزیں ہیں جو ایک شخص کو اس بات کی طرف کھینچتی ہیں کہ وہ ملازمت مل جانے کے بعد اور زیادہ محنت کرے، اپنے علم اور تجربے کو اور آگے بڑھائے اور خود بھی آگے بڑھے۔

چلیے اب ہم دیکھتے ہیں کہ ہم نے دین کی خدمت کرنے والے حفاظ، ائمہ، مولویان کرام، علما، فاضلوں اور دین کے مفتیوں کو کس موڑ پہ لاکر کھڑا کردیا ہے؟ ہم اپنی مسجد کے امام کو تو چھ ہزار روپے اجرت دیتے ہی ہیں۔ ہم ایک مولوی کو بھی چھ ہزار روپے اجرت ہی دیتے ہیں۔ ایک عالم کو بھی چھ ہزار روپے اجرت ہی دیتے ہیں۔ ایک فاضل کو بھی چھ ہزار روپے اجرت ہی دیتے ہیں۔

پھر اگر ایک فاضل نے فضیلت کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ادب میں ریسرچ کی اس کو بھی ہم چھ ہزار روپے اجرت ہی دیتے ہیں۔ اسی طرح ایک فاضل جس نے فضیلت کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد علم حدیث میں ریسرچ کی، ہم اس کو بھی چھ ہزار روپے اجرت ہی دیتے ہیں۔ آخراً ایک ایسا فاضل جس نے فضیلت کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد فقہ میں ریسرچ (Research) کی ہے یعنی وہ ایک مفتی ہے اس کو بھی چھ ہزار روپے اجرت ہی دیتے ہیں۔ اماموں، علما، مفتیان کرام اور دین کے خادموں کے لیے ہمارے نزدیک علم، تجربے، منصب، مقام اور مرتبے کے گھٹنے اور بڑھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نہ ملازمت ملنے سے پہلے اور نہ ملازمت ملنے کے بعد۔

پھر ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ آج کل کے علما میں علم بہت کم ہے۔ ان کے پاس ہمارے

سوالات کے جوابات نہیں ہیں۔ ان میں قابلیت اور صلاحیت کی کمی ہے۔ لیکن علما اور دین کے خادموں کے لیے ایسا کیا ہے جو انہیں اس بات کی طرف کھینچے کہ وہ اپنے علم کو بڑھائیں، اپنے تجربے کو بڑھائیں اور محنت اور جدوجہد کریں؟ ایسی کیا چیز ہے جو ان کے اندر حوصلہ، جذبہ اور ولولہ پیدا کرے؟ ایسا کونسا صلہ ہے اس پوری دنیا میں ان کے لیے جو انہیں اپنی قابلیت اور صلاحیت میں اضافہ کرنے پر ابھارے؟

وہ چاہے جتنی محنت کرلیں، مذہب اسلام کی تمام کتابوں کو حفظ ہی کیوں نہ کرلیں، ان کو وہیں رہنا ہے جہاں وہ ہیں۔ نہ ان کے مقام و مرتبے میں کسی قسم کا کوئی اضافہ ہونا ہے، نہ یہ ہونا ہے کہ ہم ان کو پہلے سے زیادہ بلند عہدے اور مقام پر فائز کردیں گے اور نہ ہی یہ ہونا ہے کہ ہم ایک روپیہ ان کی اجرت میں بڑھادیں گے۔ ایسی کیا چیز ہے ان کے سامنے جو انہیں سخت کوشش اور جانفشانی پر ابھارے؟ جو انہیں اپنا تن من دھن سب کچھ لگانے کے لیے اکسائے؟ کچھ بھی تو نہیں۔ ان کو اب بھی چھ ہزار ہی ملتے ہیں۔ وہ اپنا سب کچھ لگادیں تب بھی ان کو چھ ہزار ہی ملنا ہیں۔ وہ حافظ قرآن بنیں تب بھی ان کو چھ ہزار ہی ملنا ہیں اور اس کے ساتھ اگر وہ اپنی زندگی کے ایک درجن سے زیادہ قیمتی سال لگاکر مفتی و محقق بن کر آئیں تب بھی ان کو چھ ہزار ہی ملنا ہیں۔ یا ان دونوں منصبوں اور ڈگریوں کے بیچ میں کہیں رک جائیں تب بھی ان کو چھ ہزار ہی ملنا ہیں۔

پھر ایک بار ملازمت یا خدمت دین کا کوئی عہدہ ملنے کے بعد بھی وہ چاہے جتنی محنت اور جانفشانی سے کام کریں اس سے بھی ان کو کوئی ترقی یا پروموشن نہیں ملنے والی۔ محنت و کاوش سے بھرے سالہا سال گذر جانے کے بعد بھی ان کو اسی مقام اور منصب پر رہنا ہے جہاں سے انہوں نے شروعات کی تھی۔ ایک مفتی چاہے کتابوں کے لکھ کر ڈھیر لگادے ہمارے زمانے میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ جو حالات اس کے کتابیں

لکھنے سے پہلے تھے وہی زمینی سطح پر کتابیں لکھنے کے بعد بھی رہیں گے، یہ الگ بات ہے کہ لوگ اس کے القاب میں ایک دو الفاظ کا اضافہ کر دیں۔

دراصل جو ہم زمین میں بوتے ہیں وہی زمین سے نکلتا ہے۔ ہم چونکہ دین کی زمین میں سالوں سے کھوٹے سکے ڈالتے آرہے ہیں اس لیے ہم کو جو پیداوار مل رہی ہے وہ ویسی ہی ہے جو ان سکوں کے بدلے میں ہم کو ملنی چاہیے۔ اس لیے ہم جو یہ بولتے ہیں کہ علما کے اندر علم کی کمی ہے، ہمارے سوالات کے جوابات دینے کی قوت نہیں ہے، ان کے اندر صلاحیت اور قابلیت کی کمی ہے، ان کے علم اور تجربے میں پختگی نہیں ہے، علما اب پہلے کے جیسے نہیں رہے، اس طرح کے جملے بولنے سے پہلے ہمیں اپنی کھیتی کی زمین کو کھود کر اسے چیک کرنا چاہیے کہ ہم نے بیج کیسا ڈالا ہے؟ جب ہم چیک کریں گے تو معلوم ہوگا کہ نہ صرف یہ کہ ہم نے بیج اچھے نہیں ڈالے تھے بلکہ بہت سی جگہیں ایسی بھی ہیں جہاں ہم نے بیج ڈالے ہی نہیں۔

سچ یہ ہے کہ ہم نے اپنے دین کے مفتیان کرام تک کو یعنی اس عہدے کے حاملوں کو کہ جس عہدے سے بڑھ کر کوئی علمی عہدہ نہیں ہے، مزدوروں کی صف میں لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ بلکہ مزدوروں کے حالات مفتیان کرام سے بہتر ہیں۔ کیونکہ ایک مزدور کی اس کے باوجود کہ اس نے نہ علم حاصل کیا اور نہ کسی طرح کی تربیت حاصل کی، ہم اتنی قدر تو کرتے ہی ہیں کہ اس کے کام کی قدر و قیمت ہم پندرہ ہزار روپے لگاتے ہیں۔

جبکہ ایک مفتیٔ دین جس نے سالہا سال اپنی تعلیم اور تربیت میں صرف کیے جن میں کا ہر سال جانفشانی اور جدوجہد سے بھرا تھا اور ملازمت مل جانے کے بعد بھی اس کی محنت اور جانفشانی میں ذرہ برابر کمی نہیں آتی ہم اس کے کام اور خدمات کی قدر و قیمت چھ ہزار روپے سے زیادہ لگانے کو تیار نہیں۔ ہم نے علما اور مفتیان کرام کو جن کا درجہ خدا کی نگاہ میں

اتنا بلند ہے کہ اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے اتنا نیچے گرادیا ہے کہ اب ان سے نیچے شاید کوئی اور نہیں ہے۔

کون ہے چھ ہزار کے پیچھے؟

کون ہے اس چھ ہزار کی کہانی کے پیچھے؟

میں؟

آپ؟

کوئی ایک شخص؟

یا ہر مسلمان؟

کون ہے اصل ذمے دار؟

کہاں ہے وہ؟

کہاں رہتا ہے؟

اس کا ذمے دار دراصل ہر مسلمان ہے۔ ہر گاؤں، ہر قصبے، ہر شہر اور ہر بستی میں رہنے والا ہر مسلمان ذمے دار ہے۔ اس کے لیے وہ لوگ بھی ذمے دار ہیں جو کسی مسجد، مدرسے، دینی تنظیم، تحریک یا ادارے کی کمیٹی کے صدر، سکریٹری، خزانچی ہیں یا ممبران میں سے ہیں یا کسی اور قسم کے عہدے دار ہیں۔ اور وہ لوگ بھی ذمے دار ہیں جو ان میں سے کچھ بھی نہیں ہیں بلکہ عام لوگوں میں سے ہیں۔

اس ذمے داری سے کسی کو بھی الگ نہیں رکھا جاسکتا۔ جن لوگوں کے پاس

اختیارات تھے اور طاقت تھی جیسے وہ لوگ جو ممبران میں سے تھے، یا صدر، خزانچی اور سکریٹری وغیرہ تھے انہوں نے اپنے اختیارات اور قوت کا درست استعمال کیوں نہیں کیا؟ اور جن کے پاس اختیارات نہ تھے اور قوت نہ تھی انہوں نے ان لوگوں سے جن کے پاس اختیارات تھے اور قوت تھی اس بارے میں سوالات کیوں نہ کیے کہ انہوں نے اپنے اختیارات اور قوت کا درست استعمال کیوں نہ کیا؟ ذمے داری ہر ایک پر آتی ہے اور سب پر آتی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من رأى منكم منكرا فليغيره بيده، فإن لم يستطع فبلسانه، فإن لم يستطع فبقلبه، وذلك أضعف الإيمان۔[٥٠]

جب تم میں سے کوئی کسی قسم کی برائی دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے درست کردے، اور اگر ہاتھ سے نہیں کر سکتا تو زبان سے درست کردے اور اگر زبان سے بھی نہیں کر سکتا تو اپنے دل میں اسے برا سمجھے، لیکن یہ آخری شخص سب سے کمزور ایمان والا ہے۔[ت]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

كلكم راع، وكلكم مسئول عن رعيته۔[٥١]

تم میں سے ہر ایک چرواہا ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کے مویشیوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔[ت]

قرآن پاک میں ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ

---

(٥٠) النسائي، سنن النسائي (مكتبة المطبوعات الإسلامية، حلب: ١٩٨٦ء) رقم: ٥٠٠٨

(٥١) الطبراني، المعجم الأوسط (دار الحرمين، قاهرة: ١٤١٥ھ) رقم: ٣٨٩٠

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ ؕ (۵۲)

(اے امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لیے بنایا گیا ہے، تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ (ت)

اماموں، مُدرِّسوں اور علما کا یہ حال ہندوستان، پاکستان، نیپال، بنگلہ دیش اور سری لنکا سمیت کتنے ملکوں میں ہم لوگوں نے خود بنایا ہے۔ یہ کسی کی سازش کا نتیجہ نہیں ہے۔ ہم لوگ ہر معاملے میں اپنی ناکامی کو کسی کی سازش بتاکر اور اپنی غلطیوں کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہرا کر خود سکون سے بیٹھ جاتے ہیں اور اس طرح ہمیشہ اپنی غلطیوں کا محاسبہ اپنی ذات سے کرنے سے کتراتے ہیں۔ اس سے ہمیں وقتی طور پر سکون تو مل جاتا ہے لیکن اپنی پریشانیوں اور مسائل کا حل کبھی نہیں ملتا۔

کسی مسجد، مدرسے، دینی ادارے، تحریک یا تنظیم کے سارے نظام اور اس کے فنڈ کی ذمہ داری اس مسجد، مدرسے، دینی ادارے، تحریک یا تنظیم سے جڑے لوگوں کی ہے۔ یہ ذمہ داری حکومت، سرکار یا کسی کمپنی کی نہیں ہے۔ اگر کوئی مسجد، مدرسہ یا ادارہ وغیرہ اپنے بجٹ کے لحاظ سے، مالی اعتبار سے اور اپنے مجموعی نظام کے اعتبار سے مضبوط، مستحکم اور صحت مند ہے تو وہ اس لیے ہے کہ اس سے وابستہ لوگ اپنے دین کے لیے اپنی ذمے داریوں کو سمجھتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو جوابدہ سمجھتے ہیں۔ اور اگر کوئی مسجد، مدرسہ یا ادارہ وغیرہ اپنے بجٹ کے لحاظ سے اور مالی اور مجموعی نظام کے اعتبار سے ہمیشہ کمزور رہتا ہے بلکہ خسارے کا شکار رہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے وابستہ لوگ اپنے دین کے تعلق سے ان کی جو ذمے داریاں ہیں ان سے غفلت میں ہیں اور نہ ہی وہ اپنے آپ کو جوابدہ مانتے ہیں۔

---

(۵۲) آل عمران: ۱۱۰

ہم اپنے دین، ایمان اور ملت سے متعلق اپنی ذمے داریوں سے پوری طرح بے شعوری اور غفلت میں رہیں، کانوں کو بند کرلیں اور آنکھوں پر پٹیاں باندھ لیں اور امید یہ رکھیں کہ حفاظ، قراء، مولویان، علما، فضلا اور مفتیان کرام قوم مسلم کی تقدیر بدل دیں، قوم مسلم کے لوگوں کو ہر قسم کی پریشانی سے نجات دلادیں، اور نہ صرف دینی بلکہ دنیا کی بھی ہر قسم کی پریشانی سے نجات دلا دیں۔ جب سیاست کے میدان کی بات آئے تو وہ ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے سب سے آگے کھڑے ہوں۔ معاشی میدان میں وہ کوئی ایسا منصوبہ قوم مسلم کو بنا کر دیں کہ کوئی بھی انسان دنیا میں غریب نہ رہے۔ تعلیمی میدان میں وہ کوئی اس طرح کی ترکیب بنا کر دیں کہ کوئی بھی فرد معاشرے میں ایسا نہ رہ جائے جسے تعلیم نہ ملی ہو اور وہ بھی بالکل مفت۔ وہ مسلمانوں کی ان کے دشمنوں سے حفاظت کریں بلکہ ان کو ان کے تمام دشمنوں سے نجات دلادیں۔ وہ ان کو روحانی بیماریوں سے چھٹکارا دلادیں۔ وہ سماج سے ہر قسم کی برائیوں کا خاتمہ کردیں۔ وہ دنیا کے تمام مسلمانوں کو فرشتہ صفت بنادیں۔

ان میں سے ہر کام کے لیے اگر ہم الگ الگ شعبہ بنائیں اور ہر شعبے پر سالانہ لاکھوں لاکھ روپے خرچ کریں تب بھی ہم اس بات کا سو فیصد یقین کر کے نہیں بیٹھ سکتے کہ ان تمام میدانوں میں ہمیں اسی طرح کی کامیابی مل جائے گی جس طرح کی کامیابی کی امید ہم اپنے علما سے لگا کر بیٹھے ہیں۔ کیا ملکوں کی سرکاریں سالانہ اس طرح کے کاموں کے لیے کروڑوں روپے نہیں خرچ کرتیں؟ وہ اپنے مقاصد میں کتنا کامیاب ہو پاتی ہیں؟ اور ہم چھ ہزار روپے میں یہ امید کیے بیٹھے ہیں کہ علما امت مسلمہ کے تمام مسائل اور پریشانیاں معجزاتی انداز میں ختم کردیں۔

ہوا کی کشتی اور بارش کی کھیتی

ابھی تک جس طریقے سے ہم مسجدوں، مدرسوں اور دوسرے دینی اداروں کو چلاتے ہیں اس کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ ان کی فنڈنگ ایک غیر یقینی نظام پر مبنی ہے۔ یہ کچھ اس طرح کا نظام ہے جس طرح سے اس زمانے میں کشتیاں چلتی تھیں جب موٹر کی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت کشتیاں ہواؤں کے سہارے چلتی تھیں۔ مثال کے طور پر اگر پچھم کی طرف جانا ہوتا تو اس ہوا کا انتظار کرنا ہوتا جو پورب سے پچھم کی طرف چلتی ہے۔ اگر پورب سے پچھم کی طرف چلنے والی ہوا آئے گی تبھی ہماری کشتی آگے بڑھ پائے گی ورنہ نہیں۔

پچھم کی طرف بڑھنا اسی وقت ممکن تھا جب پورب والی ہوا چلے ورنہ نہیں۔ اور ظاہر ہے ہوا کا چلنا، اس کا وقت اور وہ کتنی دیر تک چلے گی اور کونسی سمت والی ہوا چلے گی یہ سب چیزیں انسان کے اختیار میں نہ اس وقت تھیں اور نہ آج ہیں۔ اس لیے سمندر کے کسی بھی سفر میں یہ طے کرنا بڑا مشکل تھا کہ وہ کتنا لمبا ہوگا۔ کتنے دنوں میں کشتی منزل تک پہنچ جائے گی، بلکہ پہنچے گی بھی یا نہیں۔ لیکن پھر جب انسانوں نے محنت کی اور عقل کا بھرپور استعمال کیا تو انہوں نے ایک ایسی چیز یعنی موٹر ایجاد کرلی کہ اس کے ہوتے ہوئے وہ ہوا پر موقوف نہ رہے۔ موٹر کو جہاں انہوں نے اور بہت سی چیزوں میں استعمال کیا وہیں اپنی کشتیوں میں بھی استعمال کیا۔ اب ان کے لیے یہ بتانا بھی ممکن ہوگیا کہ سفر کتنا لمبا ہوگا اور کشتی کتنے دنوں میں اپنی منزل تک پہنچ جائے گی اور سفر بھی پہلے سے زیادہ تیز اور محفوظ ہوگیا۔

یا پھر یہ فنڈنگ کا نظام اس طرح کا نظام ہے جیسے اس وقت کی کھیتی جب اس طرح کی ٹیکنالوجی اور سہولتیں دنیا میں نہ تھیں جیسی آج کے زمانے میں ہیں۔ اس وقت کھیتیاں

پوری طرح بارش پر موقوف تھیں۔ نہروں کا بھی انتظام نہ تھا کہ ان کا استعمال کر کے دوسرے علاقے کا پانی اپنے علاقے میں لایا جا سکے اور اس طرح اگرچہ اپنے علاقے میں بارش نہ ہو رہی ہو لیکن ان نہروں کا استعمال کر کے دوسرے علاقے کا پانی جہاں بارش ہو رہی ہے یا جہاں کسی اور وجہ سے پانی موجود ہے اپنے علاقے میں لا کر اس کا استعمال کھیتیوں میں کیا جا سکے۔ اُن حالات میں اگر بارش ہو گئی تب تو زمینوں میں اناج پیدا ہو گیا اور لوگوں کے کھانے کا انتظام ہو گیا اور اگر بارش نہ پڑی تو قحط پڑ گیا جس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کی جان چلی جاتی۔ اور کسی بھی آنے والے سال کے بارے میں یہ کوئی یقین کے ساتھ نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ اچھا رہے گا یا برا؟

اس معاملے میں بھی جب انسانوں نے محنت کی اور اپنی عقل کا استعمال کیا تو اس پریشانی کا بھی حل نکال لیا۔ انہوں نے ایسی ٹیکنالوجی ایجاد کر لی کہ وہ اب زمین میں کہیں سے بھی اور کسی بھی موسم میں پانی نکال سکتے تھے۔ اس ٹیکنالوجی کی وجہ سے وہ بارش پر موقوف نہ رہے۔ اب وہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے تھے کہ اس سال کی طرح اگلے سال بھی ان شاء اللہ اتنا اناج پیدا ہو گا کہ بھوک کی وجہ سے کسی کی جان نہیں جائے گی۔

ہماری مسجدوں، مدرسوں اور دین کے دوسرے اداروں کا دارومدار اسی طرح کے نظام پر ہے جیسے ہوا سے چلنے والی کشتی اور بارش والی کھیتی۔ اکثر مسجدوں، مدرسوں اور دینی اداروں کی ایک کمیٹی ہوتی ہے۔ یہ کمیٹی یا اس کے کچھ ممبر جو اس کام کے لیے خاص کر لیے جاتے ہیں ہر مہینے یا اس سے کم یا زیادہ دنوں میں چندہ کرنے کے لیے نکلتے ہیں۔ کبھی اس کام کے لیے عام لوگوں کو بھی شامل کر لیا جاتا ہے۔ وہ لوگوں کے گھروں پر جا کر دستک دیتے ہیں۔ گھر کے اندر سے ایک شخص آتا ہے۔ یہ اس سے کہتے ہیں کہ ہم مسجد، مدرسے، فلاں دینی ادارے یا تنظیم کا چندہ کرنے کے لیے آئے ہیں۔ وہ اپنی مرضی سے دس، پچاس، سو یا

دو سو روپے جتنے اس کو سمجھ میں آتے ہیں دے دیتا ہے۔

پھر کچھ لوگ دیتے ہیں اور کچھ نہیں دیتے ہیں۔ کچھ لوگ اس بار دے دیتے ہیں لیکن وہ اب اگلی بار نہیں دیں گے۔ کچھ وہ لوگ جنہوں نے اس بار ایک بھی روپیہ نہیں دیا شاید وہ اگلی بار کچھ دے دیں۔ جن لوگوں نے اس بار دیا ہوسکتا ہے اگلی بار وہ اس سے زیادہ دیں۔ لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے کم دیں یا کچھ بھی نہ دیں۔ یہ سب مرضی کی بنیاد پر چلتا ہے۔ جس کی مرضی ہو دے۔ جس کی مرضی نہ ہو نہ دے۔ اور جس کی جتنی مرضی ہو اتنا دے۔ کسی سے کوئی شکایت نہ کسی سے کوئی گلہ۔ فنڈنگ کے اس طریقے کو ہم ”دستک چندہ“ کہہ سکتے ہیں۔

مسجدوں کے لیے اس طریقے سے تو فنڈ اکٹھا کیا ہی جاتا ہے، ان کے فنڈ کے لیے ایک دوسرا طریقہ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ جمعے کے دن دو طرح کے چندے اکٹھے کیے جاتے ہیں۔ ایک بڑا چندہ اور دوسرا چھوٹا چندہ۔ بڑا چندہ جمعے کے دن امام صاحب کی تقریر کے بعد عربی خطبے سے پہلے ہوتا ہے۔ اس چندے میں جو شخص بھی تعاون کرتا ہے اس کے نام کا اور اس نے جتنا تعاون کیا اس کا لوگوں کے سامنے اعلان کیا جاتا ہے اور اس کو دعا بھی دی جاتی ہے۔ چھوٹا چندہ جمعے کی نماز کا سلام پھیرنے کے بعد ہوتا ہے۔ جیسے ہی امام صاحب جمعے کی دو رکعت باجماعت نماز کا سلام پھیرتے ہیں، فوراً صفوں میں کچھ لوگ کھڑے ہوجاتے ہیں اور وہ ہر صف سے گذرتے ہیں اور لوگ ان کو پیسے دیتے جاتے ہیں۔ بڑے چندے میں جو فرد بھی تعاون کرتا ہے وہ عموماً سو روپے سے پانچ سو تک دیتا ہے اور چھوٹے چندے میں عموماً پانچ سے بیس روپے کے بیچ دیتا ہے۔ یہ دونوں چندے بھی اسی نظام پر چلتے ہیں کہ جو چاہے دے اور جو چاہے نہ دے اور جو دیتے ہیں وہ چاہیں تو کم دیں اور چاہیں تو زیادہ۔

اس طرح سے ”چندہ فنڈنگ“ کی کل تین قسمیں ہیں:

(۱) دستک چندہ (۲) جمعے کا بڑا چندہ (۳) جمعے کا چھوٹا چندہ

کچھ مقامات ایسے ہیں جہاں چندے کی ان تینوں قسموں کا استعمال کیا جاتا ہے، کچھ ایسے ہیں جہاں ان میں سے صرف دو قسموں کا استعمال کیا جاتا ہے اور کچھ ایسے ہیں جہاں ان میں سے صرف ایک قسم کا استعمال کیا جاتا ہے۔

جس طرح ہوا کے سہارے چلنے والی کشتی کے بارے میں کچھ بھی یقین سے کہنا مشکل تھا اور جس طرح بارش والی کھیتی کے بارے میں کچھ بھی یقین سے کہنا مشکل تھا اسی طرح چندے کی ان تینوں قسموں پر چلنے والے مسجدوں، مدرسوں، اداروں اور تنظیموں کے فنڈ کے بارے میں کچھ بھی یقین سے کہ دینا مشکل ہے۔ چندوں کے اس طرح کے نظام پر چلنے والے ادارے، مسجدیں، مدرسے اور تنظیمیں عموماً مالی کمزوری اور خسارے کا شکار رہتے ہیں، ان کا بجٹ اور فنڈ ہمیشہ ناکافی رہتا ہے۔

اس نظام کو اسی طرح بدلنے کی ضرورت ہے جس طرح کشتیوں کا نظام بدل دیا گیا۔ اور جس طرح بارش والی کھیتیوں کا نظام بدل دیا گیا۔ اب کشتیاں ہوا سے نہیں بلکہ تیل سے چلتی ہیں۔ اور کھیتیاں بارش کے پانی سے زیادہ زمین کے پانی سے ہوتی ہیں۔ کشتیوں میں انجن فٹ کر دیے گئے ہیں۔ تیل (پیٹرول یا ڈیزل) کی مدد سے وہ انجن چلتے ہیں اور ان کی مدد سے کشتیاں چلتی ہیں۔ اسی طرح کھیتیوں کے لیے پانی بھی انجن کی مدد سے زمین سے نکالا جاتا ہے۔ اور انجن کو اکثر تیل کی مدد سے چلایا جاتا ہے۔ ہوا اور بارش ہمارے کنٹرول میں نہیں تھے۔ لیکن تیل کے سلسلے میں بہت سی چیزیں ہمارے اختیار میں ہیں۔

کم سے کم یہ بات ہمارے اختیار میں ہے کہ ہمیں جتنے تیل کی ضرورت ہے اتنا ہمیں مل جائے گا اور جس وقت ضرورت ہے اس وقت مل جائے گا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اب ہم

کشتیوں اور کھیتیوں کے بارے میں بہت سی باتیں یقین سے کہہ سکتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کشتی اس مقام تک جہاں ہم جانا چاہتے ہیں کتنے وقت میں پہنچ جائے گی؟ کتنا خرچ آئے گا؟ اور سفر میں ہمیں کتنی آسانی رہے گی اور کتنی مشقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا؟ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس سال بھی اناج اتنا ہی پیدا ہو جائے گا جتنا گزشتہ سال پیدا ہوا تھا۔ یہ سب باتیں ہم ہوا والی کشتی اور بارش والی کھیتی کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے۔

مسجدوں، مدرسوں، دینی اداروں اور تنظیموں کے سلسلے میں ہوا والی کشتی اور بارش والی کھیتی جیسے نظام کے بجائے ایک منصوبہ بند طریقے سے کام کرنے کا وقت آگیا ہے۔ وقت آگیا ہے کہ ہم موٹر والی کشتی اور زمین کے پانی والی کھیتی والا نظام اپنا لیں۔ ہمیں ایک غیر یقینی نظام سے یقینی نظام کی طرف شفٹ (Shift) کرنے کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لیے سب سے پہلے کسی بھی مسجد، مدرسے، دینی ادارے یا تنظیم کے بارے میں اس بات کو سمجھنا چاہیے کہ اس کے لیے کیے جانے والے کاموں کا دائرہ کتنا بڑا ہے؟ یعنی ایک مسجد، مدرسے، ادارے یا تنظیم کو روزانہ کتنی طرح کے کاموں کی ضرورت ہے؟ اور کل کتنے لوگ ہمیں مختلف کاموں کے لیے منتخب کرنے کی ضرورت ہے؟

مثلاً اگر ہم مسجد کی بات کریں تو کم از کم پانچ افراد کا ہونا اس قدر ضروری ہے کہ ان میں سے ایک کو بھی ہم نے کم کیا تو مسجد کا نظام درست طریقے سے نہیں چل سکتا۔ سب سے پہلے ایک امام کی ضرورت ہے۔ پھر ایک مؤذن کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ الگ سے ایک مدرس کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے بعد ایک ایسے فرد کی ضرورت ہے جو مسجد کی صفائی ستھرائی، پانی اور مسجد کی دیکھ ریکھ (Maintenance) سے متعلق دوسری باتوں کا خیال رکھے۔ پھر ایک ایسے فرد کی ضرورت ہے جو مسجد کے فنڈ کا انتظام اور اس کے حساب وکتاب سے متعلق کاموں کو دیکھے۔ اور لازمی طور پر ان میں سے ہر ایک فل ٹائم

(Full Time) ملازمت پر رکھا جائے۔ ہاں اگر کچھ دقتیں ہیں تو یہ کیا جاسکتا ہے کہ امام، مؤذن اور مدرس کو فل ٹائم ملازمت دی جائے اور دوسرے باقی دو کاموں کے لیے پارٹ ٹائم (Part Time) لوگ رکھ لیے جائیں۔

چونکہ امام، مؤذن اور مدرس کو فل ٹائم ملازمت کے لیے رکھا گیا ہے اس لیے ان کو پوری تنخواہ دی جائے۔ اور باقی دو ملازم چونکہ پارٹ ٹائم ملازمت پر ہیں ان کو پوری سے کم تنخواہ دی جاسکتی ہے۔ لیکن ان دونوں سے کام ایسے وقتوں میں لیا جائے کہ وہ مسجد کے کاموں کے ساتھ کوئی دوسرے کام بھی کر سکیں۔ مثلاً کسی ایسے فرد کو مسجد کی صفائی ستھرائی اور دیکھ ریکھ کے کام کے لیے ملازم رکھا جاسکتا ہے جو کرانا کی دوکان چلاتا ہے یا کھیتی کرتا ہے۔ اس طرح کے لوگ اپنی اپنی دوکان اور کھیتی پر بھی دھیان دے سکتے ہیں اور ساتھ ہی مسجد کی دیکھ ریکھ کے کام پر بھی۔ ان کو کچھ پیسے ان کی دوکان یا کھیتی سے ملیں گے اور کچھ پیسے مسجد سے اور ان کی زندگی ایک اطمینان بخش طریقے سے چل پائے گی۔

اسی طرح مسجد کے فنڈ کے انتظام اور اس کے حساب وکتاب کے لیے بھی کسی ایسے فرد کو کام پر رکھا جاسکتا ہے جس کے پاس کوئی اور کام بھی ہو۔ لیکن جو لوگ تمام قسم کے کاموں پر فل ٹائم لوگ رکھ سکتے ہیں وہ تمام قسم کے کاموں کے لیے فل ٹائم لوگ ہی رکھیں۔ اور جو نہیں رکھ سکتے وہ جتنی جلدی ہوسکے اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کریں کہ فل ٹائم رکھ سکیں۔

اس کے بعد تمام قسم کے ملازمین کی ٹوٹل ماہانہ تنخواہ کتنی بنتی ہے اس کا حساب لگایا جائے۔ اور اس کو مسجد کے محلے کے تمام گھروں پر تقسیم کردیا جائے۔ اور اصول یہ رکھا جائے کہ جتنے پیسے بنیں گے اُتنے ہر گھر والے کو لازمی دینا ہی ہوں گے۔ اس میں دینے اور نہ دینے کا اختیار نہیں ہوگا۔ اس طرح کی فنڈنگ کو ہم ''لازمی مقتدی تعاون'' کہہ سکتے ہیں۔

لیکن غریبوں کے ساتھ نرمی اور رحم کا معاملہ کیا جائے۔ بہتر یہ ہوگا کہ ان سے تعاون نہ لیا جائے۔ اور غریب گھروں سے تعاون نہ ملنے کی وجہ سے تعاون میں جتنی کمی آئے اس کمی کو محلے کے وہ افراد اپنے ذمے لے لیں جنہیں اللہ رب العزت نے مال و دولت اور خوشحالی سے نوازا ہے۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو امید ہے اللہ رب العزت اپنے حبیب مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے ان کی خوشحالی کو اور بڑھائے گا۔

مثلاً اگر ایک مسجد کے متعلقین میں دس گھر ایسے ہیں جو تنگ حالی اور غربت سے دوچار ہیں تو دس خوشحال لوگ ان غریب گھروں کی طرف سے جو تعاون مسجد کو دیا جاتا اس کی ذمے داری اپنے اوپر لے لیں یا پانچ خوشحال لوگ دو دو لوگوں کا تعاون اپنی ذمے داری میں لے لیں۔ یا دو لوگ پانچ پانچ لوگوں کے تعاون کو اپنی طرف سے ادا کرنے کی ذمے داری لے لیں۔ یہ مثالیں ہیں، جیسے ممکن ہو ویسے کرلیں۔ اور ان میں سے کوئی بھی یہ خیال اپنے دل میں نہ لائے کہ وہ ان غریب لوگوں پر احسان کر رہا ہے۔ اس صورت میں اس کا غریبوں کے تعاون کی ذمے داری اپنے اوپر لینے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ احسان جتانے سے ثواب ختم ہو جاتا ہے۔ اس موقعے کو اللہ کی طرف سے غنیمت سمجھے۔ جو اللہ کی راہ میں اللہ کی رضا کے لیے خرچ کرتا ہے اللہ اسے کئی گنا زیادہ دیتا ہے۔ اور جو غریب گھر تعاون دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے ان کے نام کو مخفی رکھنا ہم سب کی ذمے داری ہے کیونکہ کسی بھی مسلمان کی عزت واحترام کی حفاظت کرنا ہم سب کی ذمے داری ہے۔

لوگ ماہانہ بجلی کے بل دیتے ہیں، کچھ ٹیلی ویژن چینلوں کے بل ماہانہ دیتے ہیں، پانی کے بل ماہانہ دیتے ہیں، اخبار کے بل ماہانہ دیتے ہیں، اسکولوں میں بچوں کی فیسیں ماہانہ دیتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور بھی بل ہیں جو لوگ ہر مہینے دیتے ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ ہم اسی نظام کو مسجد اور امامت کی دنیا میں بھی لے کر آئیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ دین کو اس کی

مضبوط بنیادوں پر پھر سے کھڑا کر دیں تو ہمیں ایسا کرنا ہو گا۔ جن خرچوں کو ہم لوگ اہم سمجھتے ہیں ان کو پورا کرنے کے لیے ہم کماتے ہیں اور محنت کرتے ہیں۔ مسجد اور امامت سے متعلق خرچوں کو بھی ہم اہم سمجھیں گے تو ان کے لیے بھی کمائیں گے اور محنت کریں گے۔

اسی طرح مسجد کے علاوہ دینی مدارس، تنظیموں اور اداروں کے منتظمین کو بھی پہلے اس بات کا جائزہ لینا چاہیے کہ انہیں اپنے مدارس، اداروں اور تنظیموں کو مؤثر طریقے سے چلانے کے لیے کتنے قسم کے کاموں کی اور کتنے کام کرنے والوں کی ضرورت ہے؟ اور پھر اسی حساب سے اپنے فنڈ اور بجٹ کا اندازہ لگا کر اس کے ایسے انتظامات کرنا چاہیے جو مستقل ہوں، ہوا اور بارش کی طرح نہ ہوں۔

اگر ہم مدرسے کی بات کچھ تفصیل سے کریں تو تعلیم دینے کے لیے مدرسین کی الگ سے ضرورت ہے۔ اس میں ہمیں اس بات کا خیال رکھنا ہو گا کہ مدرسین کی مناسب تعداد کتنی ہونی چاہیے؟ مدرسوں میں عام طور پر ایک مدرس کو سات گھنٹیاں (Periods) پڑھانا ہوتی ہیں جبکہ یونیورسٹی میں ایک استاذ کو زیادہ سے زیادہ چار گھنٹیاں پڑھانا ہوتی ہیں ورنہ دو یا تین۔ تعلیم دینے کا کام مشکل ترین کام ہے۔ اس لیے ہمیں مدرسین کو دی جانے والی گھنٹیوں کو کم کرنا ہو گا۔ کسی بھی دماغ سے ایک حد تک ہی کام لیا جا سکتا ہے۔ پھر مدرسے کی عمارت کی صفائی ستھرائی کے لیے ایک الگ ملازم کی ضرورت ہے۔ اور اگر مدرسہ بڑا ہے تو کئی ملازم درکار ہوں گے۔ پانی اور بجلی کے کاموں کے لیے ایک الگ ملازم کی ضرورت ہے۔ اگر مدرسہ بڑا ہے تو اس کام کے لیے بھی کئی ملازموں کی ضرورت ہو گی۔

مدرسے میں اگر پارک یا بغیچے ہیں تو ان کی دیکھ ریکھ کے لیے الگ سے مالی کی ضرورت ہے۔ اور اگر پارک یا بغیچہ بڑا ہے یا کئی ہیں تو پھر کئی مالیوں کی ضرورت ہے۔ اگر مدرسے میں بچوں کی رہائش کا انتظام بھی ہے تو پھر کھانا بنانے اور کھلانے کے لیے الگ

ملازمین کی ضرورت ہے۔ اور رہائشی عمارت اگر الگ سے ہے تو اس کے انتظام وانصرام، دیکھ بھال، صفائی ستھرائی اور دیگر قسم کے تمام کاموں کے لیے الگ عملے کی ضرورت ہے۔ مدرسے کے فنڈ کے انتظام اور اس کے حساب وکتاب کے لیے الگ لوگوں کی ضرورت ہے۔ یہ ہم نے صرف کچھ مثالیں دی ہیں۔ کسی بھی ادارے کو مؤثر طریقے سے چلانے کے لیے کتنے ملازمین کی ضرورت ہے اور کس کس طرح کے کاموں کی ضرورت ہے اس کا درست اندازہ تبھی ممکن ہے جب ہر ادارے کے منتظمین بیٹھ کر پر سکون دماغ سے تمام چیزوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے سوچیں، اور غور کریں۔

کچھ چیزیں وہ ہیں جن کا مسجد و مدرسے سمیت ہر ادارے کو دھیان میں رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً ایک شخص سے ایک ہی ملازم کا کام لیا جائے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ایک ہی شخص کو ہم نے صفائی ستھرائی کا کام بھی دیا ہوا ہے اور اسی کو ہم نے مالی بھی بنا رکھا ہے اور ساتھ میں ہم بجلی اور پانی سے متعلق تمام کام بھی اسی سے لیتے ہیں۔ جیسا کہ ہم مسجدوں میں اماموں اور مدرسوں میں علما کے ساتھ کرتے ہیں کہ مسجد اور مدرسے کے سارے کے سارے کام انہیں سے لیتے آئے ہیں۔ دوسری چیز جس کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہے وہ یہ ہے کہ کسی شخص سے ہم آٹھ گھنٹے سے زیادہ کام نہ لیں اب چاہے ایک عالم دین یا مفتیٔ دین ہو یا پھر صفائی کا کام کرنے والا۔ ہماری یہ عادت کہ ہم اماموں اور علما سے چوبیس چوبیس گھنٹے کام لیتے آئے ہیں اس کو چھوڑ دینا چاہیے۔ بات صرف اماموں اور علما کی نہیں ہمیں کسی سے بھی آٹھ گھنٹے سے زیادہ کام نہیں لینا چاہیے۔ اور اگر آٹھ گھنٹے سے زیادہ کام لیں تو اس کے پورے پورے پیسے الگ سے دیں۔ کام کرنے والے سے یہ نہ بولیں کہ آپ ہمارے لیے اتنا سا کام نہیں کر سکتے؟

تیسری چیز یہ ہے کہ ہفتے میں ہر ملازم کو ایک دن کی چھٹی ضرور دی جانی چاہیے۔

اس کے علاوہ مخصوص تہواروں پر بھی ان کو چھٹیاں فراہم کی جائیں۔ چھٹیاں کام کو خراب نہیں کرتیں بلکہ کام کرنے والے کے اندر مزید طاقت (Energy) پیدا کرتی ہیں، اس کو قوت سے لبریز کردیتی ہیں۔ وہ چھٹی کے بعد اور زیادہ طاقت کے ساتھ آتا ہے۔ چونکہ اماموں کو اسلامی تہواروں کے موقعے پر حاضر رہنا ضروری ہے کیونکہ وہی ان تہواروں کی اصل جان ہوتے ہیں اس لیے یہ بہانا نہ بنایا جائے کہ انہیں تہواروں پر چھٹی نہیں دی جاسکتی۔ تہواروں کے فوراً بعد انہیں چھٹی دی جاسکتی ہے اور یہ انہیں دی جانی چاہیے۔ یہ ان کا حق ہے جو ہمیں ان سے چھیننا نہیں چاہیے۔

کسی بھی مسجد کے خرچے دو طرح کے ہیں۔ کچھ خرچے ریگولر (Regular) ہیں جو ہر مہینے کے ہوتے ہیں اور یہ خرچے طے اور متعین ہیں۔ مثال کے طور پر مسجد کے تمام ملازمین کی تنخواہ کا خرچ ریگولر اخراجات میں سے ہے۔ ریگولر اخراجات کو "لازمی مقتدی تعاون" کے ذریعے ہی پورا کیا جاسکتا ہے جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ ریگولر خرچوں کو "چندہ فنڈنگ" سے پورا نہیں کیا جاسکتا اگر چہ ہم "چندہ فنڈنگ" کی تینوں قسموں کا استعمال کیوں نہ کرلیں۔ ایک تو "چندہ فنڈنگ" کے بارے میں یقین سے کچھ بھی کہنا مشکل ہے کیونکہ وہ پوری طرح لوگوں کی مرضی اور ان کے من پر موقوف ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ چندہ فنڈنگ سے ہونے والی آمدنی بہت معمولی ہوتی ہے۔

مسجد کے دوسرے خرچے وہ ہیں جو ریگولر نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر مسجد کے تعمیراتی کام، مسجد کی جگہ کو بڑھانا، خاص موقعوں پر رنگ روغن کرانا، مختلف قسم کی محفلیں اور جلسے کرانا وغیرہ یہ وہ کام ہیں جن کے لیے خرچ کی اسی وقت ضرورت پڑتی ہے جب یہ کام کیے جاتے ہیں۔ اگر یہ کام کیے جائیں تو ان کے لیے خرچ کی ضرورت ہوگی ورنہ نہیں۔

اس طرح کے کاموں کے اخراجات کے لیے "لازمی مقتدی تعاون" کی مدد لینے

کی ضرورت نہیں۔ ان کے لیے "چندہ فنڈنگ" کی مدد کافی ہے۔ چندہ فنڈنگ کے ذریعے جتنا فنڈ اکٹھا کیا جا سکتا ہو اس کو نظر میں رکھتے ہوئے تعمیراتی یا اس طرح کے دوسرے کام یا محفلیں اور جلسے وغیرہ کروائے جا سکتے ہیں۔

مدرسوں کے ریگولر اخراجات کی فنڈنگ کے چار طریقے ہو سکتے ہیں۔

(۱) ممبر فنڈنگ: اس کے لیے مدرسے کی مالی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ممبر بنائے جائیں۔ ممبر کئی طرح کے ہو سکتے ہیں۔ کچھ ممبر ایسے ہو سکتے ہیں جو تین مہینوں تک ایک طے شدہ رقم ہر مہینے دیں گے۔ کچھ ایسے ہو سکتے ہیں جو چھ مہینے تک طے شدہ رقم ہر مہینے دیں گے۔ کچھ ایسے ہو سکتے ہیں جو ایک سال تک طے شدہ رقم ہر مہینے دیں گے۔ کچھ ایسے ہو سکتے ہیں جو دو سال تک دیں گے۔ کچھ پانچ سال تک۔ کچھ دس سال تک۔ کچھ بیس سال تک اور کچھ اس سے بھی زیادہ اور کچھ اپنی پوری زندگی کے لیے۔ یہ رقم چھوٹی بھی ہو سکتی ہے اور بڑی بھی۔ اسی طرح وقت کو بھی اپنی ضرورت کے لحاظ سے گھٹایا اور بڑھایا جا سکتا ہے۔ ممبروں سے ماہانہ جتنی بھی رقم آئے گی مدرسے کا سارا نظام اور انتظام وانصرام اسی سے چلے گا، اسی پر موقوف ہوگا۔

(۲) طلبہ فنڈنگ: یعنی مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ سے فیس لی جائے اور فیس کے ذریعے سے مدرسے کے تمام اخراجات کے لیے رقم کو حاصل کیا جائے۔ اس بات کا خصوصی دھیان رکھا جائے کہ غریب طلبہ سے ہرگز فیس نہ لی جائے اور ان کے نام کو کبھی ظاہر نہ کیا جائے کیونکہ اس سے ایک تو ان طلبہ کی دل آزاری ہوگی اور دوسری بات یہ کہ پھر کوئی ثواب بھی نہ ملے گا کیوں کہ احسان جتانے سے ثواب کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب غریب طلبہ سے فیس نہیں لی جائے گی تو فنڈنگ میں کچھ کمی آئے گی۔ اس کمی کو اس طرح پورا کیا جائے کہ کچھ ممبر بھی بنا لیے جائیں اور ممبرون کی طرف سے آئی رقم

سے اس کمی کو پورا کیا جائے۔ اور اگر ممبر بنائے بغیر ان طلبہ کی فیس ہی کافی ہو جائے جو خوش حال گھرانوں سے ہیں تو اس سے بہتر اور کیا ہے؟

(۳) مضاربت فنڈنگ: اس کا طریقہ یہ ہے کہ چند لوگ مل کر ایک نئے یا پہلے سے قائم مدرسے کو چلانے کا منصوبہ بنائیں۔ وہ آپس میں یہ فیصلہ کریں کہ ان میں سے بعض پیسے خرچ کریں گے لیکن وہ کوئی کام نہیں کریں گے اور دوسرے بعض لوگ پیسے تو خرچ نہیں کریں گے لیکن مدرسے کو چلانے کے لیے جن کاموں کی ضرورت پڑے گی وہ ان کاموں کو کریں گے۔ مدرسے کی شروعات (بلڈنگ کی تعمیر وغیرہ) تو ان لوگوں کے پیسے سے ہی کی جائے گی لیکن ایک بار شروع کیے جانے کے بعد طلبہ سے فیس لی جائے گی۔ مدرسے کو چلانے کے نتیجے میں جو بھی نفع حاصل ہوا کرے گا وہ ان تمام لوگوں میں آپس میں تقسیم ہو جایا کرے گا۔

لیکن اس طریقے میں بھی اس بات کا خصوصی خیال رکھا جائے کہ غریب طلبہ سے فیس نہ لی جائے۔ ان سے فیس نہ لینے کے عوض میں اللہ رب العزت سے اجر و ثواب اور برکات کے نزول کی امید رکھنا چاہیے۔ اگر غریبوں کو اللہ نے زکوٰۃ جیسے فریضے سے الگ رکھا ہے جو اسلام کے ارکان میں سے ہے تو بندوں کو بھی چاہیے کہ ان کو فیس سے الگ رکھا کریں۔

(۴) مشارکت فنڈنگ: ایک فرق کے ساتھ مشارکت فنڈنگ مضاربت فنڈنگ ہی کی طرح ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ مضاربت فنڈنگ میں کچھ لوگوں کا پیسہ لگتا ہے اور کچھ کام کرتے ہیں، جبکہ مشارکت فنڈنگ میں تمام لوگ پیسہ خرچ کرتے ہیں اور تمام لوگ کام بھی کرتے ہیں۔ مضاربت فنڈنگ کی طرح مشارکت فنڈنگ میں بھی طلبہ سے فیس لی جائے گی۔ لیکن غریب طلبہ سے اس فنڈنگ میں بھی فیس نہیں لی جائے گی۔

ممبر فنڈنگ اور طلبہ فنڈنگ، مضاربت فنڈنگ اور مشارکت فنڈنگ سے اس طرح الگ ہیں کہ فنڈنگ کی آخری دونوں قسمیں یعنی مضاربت فنڈنگ اور مشارکت فنڈنگ تجارت کے اصولوں پر مبنی ہیں جبکہ پہلی دونوں قسمیں یعنی ممبر فنڈنگ اور طلبہ فنڈنگ تجارت کے اصولوں پر مبنی نہیں ہیں۔ ممبر فنڈنگ میں ممبر حضرات جو پیسہ بھی مدرسے کو دیتے ہیں وہ اس کے عوض میں مدرسے سے واپس کچھ نہیں لیتے۔ وہ جو کچھ بھی خرچ کرتے ہیں اللہ کی راہ میں اللہ کی رضا کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ وہ اسی سے اس کا بدلہ مانگتے ہیں انسانوں سے نہیں۔ یہ آخرت کا سودا ہے۔

اسی طرح طلبہ فنڈنگ میں طلبہ سے جو بھی پیسہ ملتا ہے وہ تمام کا تمام طلبہ اور مدرسین پر اور مدرسے کے مختلف قسم کے انتظامات اور اخراجات میں ہی لگادیا جاتا ہے، اس سے کوئی نفع بچایا یا کمایا نہیں جاتا۔ طلبہ فنڈنگ میں مدرسے کو چلانے والے لوگ (منتظمین) صرف اپنے کام کی واجبی تنخواہ لیتے ہیں، وہ اس سے کوئی پرافٹ حاصل نہیں کرتے۔ طلبہ فنڈنگ سے اگر مدرسے کی فنڈنگ بہت زیادہ ہوتی ہے تب بھی اس تمام فنڈ کو مدرسے کے اخراجات میں ہی لگایا جائے گا جن میں مدرسہ کی تعمیر و توسیع اور مدرسہ چلانے والوں کی واجبی تنخواہ بھی آتی ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ اگر فنڈنگ زیادہ ہوتی ہے تو مدرسہ چلانے والے (منتظمین) ایکسٹرا فنڈنگ کو آپس میں بطور نفع تقسیم کرلیں۔ دوسری طرف مضاربت فنڈنگ اور مشارکت فنڈنگ میں نفع حاصل کیا جاتا ہے اور اسے ان لوگوں میں تقسیم کیا جاتا ہے جو آپس میں مضاربت یا مشارکت کا معاہدہ کرتے ہیں۔

مسجدوں کے غیر ریگولر اخراجات کے لیے تو "چندہ فنڈنگ" کا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، لیکن مدرسوں یا دیگر اداروں اور تنظیموں کے غیر ریگولر اخراجات کے لیے "چندہ فنڈنگ" کی قسموں میں سے صرف "دستک فنڈنگ" سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، کیونکہ باقی

دونوں قسمیں یعنی جمعے کا بڑا چندہ اور جمعے کا چھوٹا چندہ مسجد کے لیے خاص ہیں۔ لیکن مدرسوں یا دیگر اداروں اور تنظیموں کے غیر ریگولر اخراجات جیسے عمارتوں کی تعمیر وغیرہ کے لیے "دستک فنڈنگ" کو بھی بالکل ترک کیے جانے کی ضرورت ہے۔ اگر مدرسوں اور دیگر اداروں اور تنظیموں کو مؤثر طریقے سے چلانا ہے تو ان کی فنڈنگ کو "دستک فنڈنگ" سے پوری طرح پاک کرنا ہوگا۔

دراصل "دستک فنڈنگ" کے نظام نے اپنے وقار اور اعتبار کو کھودیا ہے۔ یہ نظام بدنام ہو چکا ہے۔ لوگ رسیدوں کے ذریعے سے مدرسوں کے لیے "دستک فنڈنگ" کرنے والوں کو گداگر اور بھیک مانگنے والے لوگوں کی طرح دیکھنے لگے ہیں۔ بلکہ اب تو اس طرح سے دیکھتے ہیں جیسے رسید کاٹنے والا کوئی مشکوک انسان ہو۔ سیکڑوں گھروں کے دروازے کھٹکھٹانے کے بعد بھی گنے چنے پیسے ہاتھ آتے ہیں اور احسان پوری قوم کا اٹھانا پڑتا ہے۔

تو پھر مدرسوں یا دیگر اداروں اور تنظیموں کے غیر ریگولر اخراجات جیسے عمارتوں کی تعمیر وغیرہ کے اخراجات کو کیسے پورا کیا جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مضاربت فنڈنگ اور مشارکت فنڈنگ میں تو مدرسے کے غیر ریگولر خرچوں کے حوالے سے کسی دقت کا سامنا خود ہی نہیں کرنا پڑے گا کیونکہ ریگولر خرچوں کی طرح غیر ریگولر اخراجات کے لیے فنڈ مہیا کرنا بھی مضاربت یا مشارکت کا معاہدہ کرنے والے لوگوں کی ذمے داری ہوگی۔ اور ممبر فنڈنگ اور طلبہ فنڈنگ میں غیر ریگولر اخراجات کو پورا کرنے کے لیے "دستک فنڈنگ" کے بجائے "رابطہ فنڈنگ" سے فائدہ اٹھایا جانا چاہیے۔

رابطہ فنڈنگ سے ہماری مراد یہ ہے کہ اس طرح کے افراد سے ایک باوقار انداز میں رابطہ کیا جائے جن کو اللہ نے خوب مال و دولت سے نوازا ہو، یعنی جو لوگ مدرسے کا معقول تعاون کر سکتے ہوں۔ لیکن اس ضمن میں بھی اس بات کا خیال رکھا جائے کہ ان لوگوں

سے رابطے کیے جائیں جن کے ساتھ پہلے سے تعارف ہے۔ اور اگر پہلے سے تعارف نہیں ہے تو کسی دوسرے شخص کے ذریعے سے پہلے ان سے تعارف پیدا کیا جائے۔۔ ان لوگوں کے سامنے مدرسے کا سارا منصوبہ اور بات رکھی جائے اور پھر ان سے تعاون کے لیے درخواست کی جائے۔

"دستک فنڈنگ" اور "رابطہ فنڈنگ" کے درمیان فرق یہ ہے کہ دستک فنڈنگ زیادہ تر ان لوگوں سے کی جاتی ہے جو بالکل اجنبی ہیں۔ جو سامنے آیا اس سے رسید کٹوانے کے لیے بولنے لگے۔ رابطہ فنڈنگ صرف ان لوگوں سے کی جاتی ہے جن کے ساتھ پہلے سے تعارف ہے۔ اور اگر تعارف نہیں ہے تو ان سے کسی دوسرے شخص کے ذریعے سے پہلے باوقار تعارف پیدا کیا جاتا ہے۔ رابطہ فنڈنگ میں تعاون لینے والے اور تعاون دینے والوں کے درمیان مہمان اور میزبان کا رشتہ ہوتا ہے۔ دستک فنڈنگ میں ایک مانگنے والے کی طرح اور دوسرا بھیک دینے والے کی طرح ہو جاتا ہے۔ دستک فنڈنگ دروازے کے باہر ہوتی ہے اور رابطہ فنڈنگ مہمان خانے میں۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ رابطہ فنڈنگ میں صرف وہ لوگ آتے ہیں جو مدرسے کا معقول تعاون کر سکتے ہوں۔ اس میں مالی اعتبار سے کمزور لوگوں کو چھوٹی چھوٹی رقموں کے لیے بار بار پریشان نہیں کیا جاتا۔ دستک فنڈنگ زیادہ تر ان لوگون سے کی جاتی ہے جو مالی طور پر زیادہ خوشحال نہیں ہوتے۔ اس میں وہ لوگ گنے چنے ہوتے ہیں جو مالی طور پر بہت زیادہ خوشحال ہوتے ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ رابطہ فنڈنگ میں بہت کم لوگوں سے کام پورا ہو جاتا ہے جبکہ دستک فنڈنگ میں ہزاروں ہزار لوگوں کے دروازوں کو کھٹکھٹانا پڑتا ہے، اور پھر بھی بات بنتی نظر نہیں آتی۔

فنڈنگ کے اوپر ذکر کردہ طریقوں کے علاوہ بہت سے دوسرے اداروں اور ماہرین

سے بھی فنڈنگ کے کچھ الگ اور کارآمد طریقے سیکھے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے ملک میں اور ملک کے باہر ہزاروں نان پرافٹ تنظیمیں (Non-profit Organizations) چلتی ہیں جو الگ الگ مقاصد کے لیے بنائی گئی ہیں اور جن کا مقصد نفع کمانا یا تجارت کرنا نہیں ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ چیریٹیبل تنظیموں (Charitable Organizations) کی بھی ایک بڑی تعداد ہے جو لوگوں کو اپنی کچھ خدمات سستی اور کچھ مفت میں پیش کرتی ہیں۔ انہیں اپنے عملے کی ماہانہ تنخواہ بھی دینا ہوتی ہے۔ جو خدمات یہ دونوں قسم کی تنظیمیں فراہم کرتی ہیں ان کے لیے بھی فنڈ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی اور بہت سے اخراجات ہوتے ہیں جیسے تعمیر اور عمارتوں کے خرچ۔ ان سب چیزوں کے لیے ان کے پاس پیسہ کہاں سے آتا ہے؟ وہ کس طریقے سے رقم اکٹھا کرتے ہیں؟

اس کے علاوہ مختلف قسم کی کمپنیاں اگرچہ اپنے کسٹمرز (Customers) کو اپنی پروڈکٹس مفت میں نہیں دیتیں لیکن اس کے باوجود بھی اپنے بزنس کو کامیاب طریقے سے چلانے کے لیے ہمیشہ انہیں فنڈ اور بجٹ کو مضبوط حالت میں رکھنا ہوتا ہے۔ اس طرح کی تنظیموں اور کمپنیوں کے ذمہ داروں سے بات کرکے ان سے سیکھا جاسکتا ہے، ان سے رائے لی جاسکتی ہے۔ یا جو لوگ معاشیات یا فائنانس (Finance) کے ماہرین ہیں ان سے مشورہ کیا جاسکتا ہے اور ان سے فنڈنگ کے مختلف کامیاب طریقوں کے بارے میں جانا جاسکتا ہے۔

بہت ساری کمپنیاں، تنظیمیں اور یہاں تک کہ سرکاریں یا ان کے کچھ محکمے جب کبھی مالی خسارے کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان کو سمجھ میں نہیں آتا کہ پیسہ کہاں سے آئے؟ یا کبھی کبھی کسی قسم کے مالی خسارے کا شکار ہوئے بغیر بھی جب بھی انہیں ضرورت پڑتی ہے وہ معاشیات اور فائنانس کے ماہرین کو باقاعدہ ایک معقول رقم دے کر ہائر (Hire) کرتے ہیں

اور ان کو ایک اچھا خاصا وقت سوچنے اور غور وفکر کرنے اور تمام چیزوں کو سمجھنے کے لیے دیتے ہیں اور پھر وہ جو مشورے دیتے ہیں ان پر عمل کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ مسجدوں، مدرسوں اور دینی اداروں اور تنظیموں کے ذمہ داران خود آپس میں بھی مل بیٹھ سکتے ہیں یا ساتھ میں ان لوگوں کو بھی لے سکتے ہیں جن کے بارے میں ان کو لگتا ہے کہ وہ مفید اور قیمتی مشورے دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس طرح سے لوگ مشوروں اور میٹنگوں کا انعقاد کریں اور پر سکون دماغ سے تمام قسم کے پہلوؤں پر غور کرنے کی کوشش کریں اور فنڈنگ کے بارے میں کچھ کامیاب فیصلوں اور نتیجوں تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ مسلمان کا دماغ بصیرت والا ہوتا ہے، اور مشورے میں ایک نہیں کئی کئی دماغ کام کرتے ہیں۔ اگر اس مقصد کے لیے میٹنگ اور مشوروں کا انعقاد کیا جائے گا تو اللہ رب العزت کی ذات سے امید ہے کہ وہ اپنے حبیب مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں اپنے بندوں کو مایوس نہیں کرے گا اور مشورہ کرنے والے لوگوں کے دماغ میں کچھ نہ کچھ ایسی باتیں ڈال دے گا کہ ان کو ان کے سوالات کے جوابات مل جائیں گے۔

مشورے میں خیر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کلام مجید میں ایسے لوگ جن کے لیے اللہ کے وہ انعامات ہیں جو ہر چیز سے زیادہ بہتر اور پائیدار ہیں ان کی صفات میں آپس میں مشورہ کرکے اپنے معاملات کو طے کرنا بھی بیان فرمایا ہے۔

سورۂ شوریٰ میں ہے:

فَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَ الَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓىِٕرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ وَ اِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ یَغْفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَ الَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ ۪ وَ مِمَّا

رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۸﴾ (۵۳)

تمہیں جو کچھ بھی دیا گیا ہے وہ دنیوی زندگی کا سامان ہے۔ اور جو نعمتیں اللہ کے پاس ہیں وہ زیادہ بہتر اور پائیدار ہیں۔ یہ نعمتیں ان لوگوں کے لیے ہیں جو ایمان لائے اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اور جو کبیرہ گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں اور جب انہیں غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔ اور جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور **اپنے فیصلے باہمی مشوروں سے کرتے ہیں** اور ہم نے انہیں جو مال دیا ہے اس میں سے ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

---

(۵۳) الشوریٰ: ۳۶-۳۸

ماخذومراجع

- قرآن مجید
- محمد بن إسماعیل بخاری، صحیح البخاری (دار طوق النجاۃ، بیروت: ۱۴۱۱ھ)
- مسلم بن الحجاج، صحیح مسلم (دار ابن حزم، بیروت: ۱۴۱۹ھ)
- أبو عیسیٰ الترمذی، جامع الترمذی (دار الفکر، بیروت: ۱۴۱۴ھ)
- أبو داؤد السجستانی، سنن أبو داؤد (المکتبۃ العصریۃ، بیروت)
- ابن ماجه، سنن ابن ماجۃ (دار إحیاء الکتب العلمیۃ. فیصل عیسیٰ البابی الحلبی: ۱۹۵۲)
- النسائی، سنن النسائی (مکتبۃ المطبوعات الإسلامیۃ، حلب: ۱۹۸۶ء)
- أحمد بن حنبل، مسند الإمام احمد بن حنبل (مؤسسۃ الرسالۃ: ۲۰۰۱ء)
- أبو بکر البیهقی، شعب الإیمان (مکتبۃ الرشد للنشر والتوزیع، ریاض، بہ تعاون الدار السلفیۃ، ممبئی)
- أبو بکر البیهقی، السنن الکبری (دار الکتب العلمیۃ، بیروت: ۲۰۰۳ء)
- أبو القاسم الطبرانی، المعجم الاوسط (دار الحرمین، قاہرہ: ۱۴۱۵ھ)
- أبو القاسم الطبرانی، المعجم الکبیر (مکتبۃ ابن تیمیۃ، قاهرۃ: الطبع الأول.
- شاہ عبدالحق محدث دہلوی، مدارج النبوۃ (مرکز اہل سنت برکات رضا)
- أبو طالب المکی، قوت القلوب في معاملۃ المحبوب ووصف طریق

المر يد إلىٰ مقام التوحيد(دار الكتب العلمية، بيروت:۲۰۰۵ء)

- الخطيب البغدادى،الفقيه والمتفقه(دار ابن الجوزي، السعودية:۱۴۲۱ھ)
- ابن عبد البر، جامع بيان العلم وفضله(دار ابن الجوزي،السعودية: ۱۹۹۴ء)
- امام غزالی،احیاء العلوم(مترجم:صدیق ہزاروی،فاروقیہ بکڈپو،دہلی:۱۹۹۸)
- الدر المختار مع رد المحتار (دار الفكر،بيروت:۱۹۹۲)

مؤلف ایک نظر میں

نام : جمال احمد برکاتی مصباحی

ولدیت : حافظ و قاری عبد الرحیم چشتی

پتہ : دیار حافظ ملت، قصبہ بھوج پور، مراد آباد (یوپی، ہند)

ای میل : jamalahmadmisbahi@gmail.com

تعلیم

(۱) ابتدائی تعلیم — والد محترم

(۲) عالمیت — الجامعۃ القادریہ، رچھا ریلوے اسٹیشن، بریلی

(۳) فضیلت — الجامعۃ الاشرفیہ، مبارکپور، اعظم گڑھ

(۴) تحقیق فی الفقہ — الجامعۃ الاشرفیہ، مبارکپور، اعظم گڑھ

(۵) بی اے پولیٹکل سائنس — جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

(۶) ایم اے پولیٹکل سائنس — جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

(۷) ایم فل پولیٹکل سائنس — جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

(۸) فی الحال جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ریسرچ اسکالر (پی ایچ ڈی، پولیٹکل سائنس) ہیں۔

میرے والد محترم

حافظ و قاری عبدالرحیم چشتی مدظلہ

میری والدہ ماجدہ

محترمہ خیر النساء مدظلہا

میرے عظیم مماجان

عالی جناب محمد عرفان اطال اللہ عمرہ

(سابق صدر الاتحاد آرگنائزیشن)

کے نام

جب نحو آپ کو الجھادے

"مؤلف نے درسی کتب اور ان کی شروح وحواشی سے آگے بڑھ کر نئے دور میں تصنیف ہونے والی نحوی، صرفی اور ادبی کتب سے استفادہ کیا، کچھ قدیم تصانیف کو بھی ماخذ بنایا، اور ان سے گراں بہا موتی چن کر شائقین کی ضیافت قلب ونظر کے لیے انھیں سلیقے سے سجا کر پیش کر دیا۔"

خیر الاذکیا علامہ محمد احمد مصباحی صاحب قبلہ مد ظلہ العالی
سابق پرنسپل وناظم تعلیمات جامعہ اشرفیہ مبارک پور

"محب گرامی حضرت مولانا سرفراز قادری مصباحی زید حبہ نے ایک علمی کتاب مرتب کی ہے جس کا نام رکھا ہے: "جب نحو آپ کو الجھادے" اس کتاب میں انھوں نے صرف ونحو کی مشہور عربی کتابوں سے بھرپور استفادہ کیا ہے اور آسان لب ولہجے میں ترتیب دے کر شائقین علم نحو وصرف کے لیے استفادے کی راہیں آسان کردی ہیں۔"

علامہ محمد عاقل رضوی مصباحی صاحب قبلہ مد ظلہ العالی
پرنسپل جامعہ رضویہ منظر اسلام درگاہ اعلیٰ حضرت، بریلی شریف